چشتی تعلیمات

اور عصرِ حاضر میں اُن کی معنوّیت

ڈاکٹر نثار احمد فاروقی
دہلی یونیورسٹی، دہلی،

اسلام اینڈ دی ماڈرن ایج سوسائٹی
جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵

چشتی تعلیمات

اور عصرِ حاضر میں اُن کی معنویت

چشتی تعلیمات

اور عصرِ حاضر میں اُن کی معنویت

از

ڈاکٹر نثار احمد فاروقی

(شعبۂ عربی، دہلی یونیورسٹی، دہلی ۷)

اسلام اینڈ دی ماڈرن ایج سوسائٹی

جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

۱۹۸۱ء

یکے از مطبوعات اسلام اینڈ دی ماڈرن ایج سوسائٹی نئی دلّی

سلسلۂ جدید ـــــ ۱

© ڈاکٹر نثار احمد فاروقی ۱۹۸۱ء

طبعِ اوّل : جنوری ۱۹۸۱ء

تعداد : ایک ہزار

مطبع : جیّد پریس دہلی

قیمت :

۹ ، ۵۰

نو روپے پچاس پیسے

عالی جناب نواب میر اکبر علی خاں صاحب

سابق گورنر یو۔پی

کی

خدمت میں

فہرست

حرفِ ابتدا : ڈاکٹر نثار احمد فاروقی ۹

مقدمہ : حضرت خواجہ حسن ثانی نظامی ۱۱

پیش لفظ : کرنل سیّد بشیر حسین زیدی ۱۵

۱۔ چشتی تعلیمات کا مقصد ۱۹

۲۔ خانقاہی تربیت کا نصاب ۲۵

نفس کشی ۲۶

ترکِ دنیا ۳۰

روحِ عبادات ۳۴

خدمتِ خلق ۳۶

۳۔ خانقاہی تربیت کا ماحصل ۴۰

توبہ و استقامت ۴۰

صدق و اخلاص ۴۱

اِطعام ۴۲
توکّل ۴۳
اِنفاق ۴۴
۴- عہدِ حاضر میں چشتی تعلیمات کی معنویت ۴۷
۵- صوفیا کا تصوّرِ عشق ۵۳
عقل اور عشق ۶۶
ذکر کی حکمت ۶۸
کثرتِ ذکر کا فلسفہ ۷۰
ذکر کا جواز ۷۱
مراقبہ اور اس کی غایت ۷۴
حوالے اور کتابیات ۷۹

حرفِ ابتدا

اسلامی تصوّف روحانی بلندی اور اخلاقی پاکیزگی کا "حال" تھا یعنی علم کا عملی نمونہ۔ لیکن اس پر سیاسی زوال اور اخلاقی انحطاط کا سایہ پڑا تو یہ محض "بُرا حال" بن کر رہ گیا۔

تصوّف کا اوّلین مقصد احتسابِ نفس تھا لیکن یہ اکتساب کا ذریعہ بنا لیا گیا۔ صوفیاء اپنے مقامات روحانی اور مریدوں کی اخلاقی بیماریوں کی پردہ پوشی کرتے تھے لیکن آج کے صوفی تصوّف اور کرامات کا اشتہار بن گئے ہیں۔

تصوّف سراسر ادب اور تہذیب تھا لیکن اب خودسری و بے عملی کا دوسرا نام ہوگیا ہے۔ اس میں عجز و انکسار، فقر و فنا اور بذل و ایثار کی تعلیم دی جاتی تھی۔ اب تصوّف کے نام پر زیادہ تر خود بینی، خود نمائی، خود غرضی، خود فریبی اور خدا فریبی، دنیا پرستی، جاہ طلبی اور غرور و نخوت کے نمونے سامنے آتے ہیں۔

مطالعۂ تصوّف کا رجحان اس زمانے میں خاص طور سے بیدار ہوا ہے اور جنوب مغربی ایشیا کے علاوہ مغربی ممالک میں بھی اس کی طرف توجہ کی جا رہی ہے۔ لیکن تصوّف کا سمجھنا دراصل اُسے "برتنا" ہے اور مغربی ممالک کی

رسائی جس طرح کے روحانیت کے تاجروں تک ہے ان کی مدد سے تصوّف کے بارے میں کچھ مزید غلط فہمیاں تو پیدا ہو سکتی ہیں اس کا "عرفان" حاصل نہیں کیا جا سکتا۔

یہ مقالہ سب سے پہلے درگاہ شریف اجمیر میں منعقدہ ایک آل انڈیا سیمینار میں پڑھا گیا تھا، اِسے جو مقبولیت نصیب ہوئی اُس سے مجھے اپنے بارے میں کسی خوش فہمی میں مبتلا ہونے کی بجائے صرف یہ یقین حاصل ہوا کہ جب لوگ تصوّف کی نظری تعریف اور ترجمانی سننے کے لیے اتنے مشتاق ہیں تو اُس کا عملی نمونہ دیکھنے کی پیاس کتنی شدید ہوگی! کاش ہمارے خانقاہی بزرگ اب بھی اُمّت کی روحانی تشنگی کو دور کرنے کی اپنی ذمّہ داری کا سچّا احساس پیدا کریں جس میں اسلام اور مسلمانوں کی سربلندی کا حقیقی راز بھی پوشیدہ ہے۔ پندرھویں صدی ہجری کا استقبال کرتے ہوئے ہمارا سب سے بڑا عہد یہی ہو سکتا ہے۔

اسلام اینڈ دی ماڈرن ایج سوسائٹی کے مقاصد کی نوعیّت دو گونہ ہے۔ ایک طرف علمائے اسلام کو 'عصر جدید' سے واقف کرانا، دوسری طرف عصر جدید کو بھی احتیاج ہے کہ وہ مذاہب عالم کو عموماً اور اسلامی تعلیمات کو خصوصاً صحیح طور پر سمجھنے کی کوشش کرے۔ آج کی حقیقی تبلیغ و رسالت بھی یہی ہے۔ سوسائٹی کی طرف سے اس کتابچہ کی اشاعت اسی مقصد کو ذہن میں رکھتے ہوئے عمل میں آ رہی ہے۔

واللہ المُستعان وعلیہ التّکلان وھُو ولیُّ التّوفیق۔

شعبہ عربی، دہلی یونیورسٹی، دہلی

نثار احمد فاروقی

۲۰- دسمبر ۱۹۸۰ء
۱۱- صفر ۱۴۰۰ھ

مقدّمہ

برادرم ڈاکٹر نثار احمد فاروقی (ریڈر شعبۂ عربی دہلی یونی ورسٹی) کا نام علمی اور ادبی حلقوں میں جانا پہچانا نام ہے۔ لیکن یہ بات بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگی کہ تصوّف کی دنیا میں بھی اُن کا بڑا مقام ہے۔ موصوف شیخ شیوخ العالم حضرت بابا فرید الدین مسعود گنج شکرؒ کی اولاد ہیں اور چشتیہ صابریہ سلسلے کے مشہور بزرگ حضرت شاہ سلیمان احمد امروہویؒ (سجادہ نشین درگاہ حضرت شاہ عبدالہادی چشتی علیہ الرحمۃ) کے نواسے ہی نہیں، ان سے فیض یافتہ بھی ہیں۔ اس لیے عہدِ حاضر میں چشتی تعلیمات کی معنویت کو سمجھنے اور سمجھانے کا حق اُن سے زیادہ اور کون ادا کر سکتا تھا؟ انھوں نے سینے اور سفینے دونوں سے علم کا وافر حصّہ حاصل کیا ہے اور نئے زمانے کی ضروریات اور تقاضوں

سے واقف ہونے کے ساتھ ساتھ دردمند دل بھی پایا ہے جس کے بغیر روحانی دُنیا کا کوئی کام نہیں چلتا۔ فاروقی صاحب ہماری خانقاہوں کے جمود سے ہمیشہ کڑھتے رہتے ہیں اور حتی الامکان کوشش کرتے ہیں کہ یہ جمود ٹوٹے اور یہ برف پگھلے اور تحریکِ تصوّف میں ایک نئی جان پڑ جائے۔ خاص کر چشتی سلسلہ نہ صرف اپنی عظمتِ رفتہ کو حاصل کرلے، بلکہ نئے زمانے کو اُس سے وہ رہنمائی مل سکے جس کی آج کل ہر طرف سے مانگ ہے۔ چنانچہ ہندوستان کی کئی اہم درگاہوں اور خانقاہوں میں فاروقی صاحب نے علمی مذاکروں کا اہتمام کرایا ہے اور ہمارے ہاں درگاہ سلطان المشائخ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء محبوبِ الٰہیؒ میں تو برس بھر میں وہ تین بڑے اجتماع کرتے ہیں اور علماء اور مشائخ سے مقالے پڑھواتے ہیں اور تقریریں کراتے ہیں۔ دکن میں بارگاہ حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو درازؒ کے سجّادہ نشین حضرت سیّد محمد الحسینی بھی ہر سال ان کو اپنے ہاں مدعو کرتے ہیں اور فاروقی صاحب کے پُرمغز اور پُراثر مقالوں کو سُننے کے لیے دور دور سے لوگ جمع ہوتے ہیں۔ خانقاہی حلقوں میں اِن اجتماعات اور مذاکروں سے ایک نیا شعور اور احساس پیدا ہوا ہے اور مجھے یقین ہے کہ اِن شاء اللہ اس سے فاروقی صاحب کا مقصد حاصل ہونے میں بہت مدد ملے گی۔

زیرِ نظر رسالہ بھی ڈاکٹر نثار احمد صاحب فاروقی فریدی کے اُس معرکۃ الآرا مقالے کی مطبوعہ شکل ہے جو چند سال پہلے چشتیوں کے مرکز سلطان الہند حضرت خواجۂ خواجگان خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ کی بارگاہ میں پڑھا گیا تھا۔

حضرت بابا فرید میموریل سوسائٹی کے تعاون سے حضرت صاحبزادہ سید حلیم میاں چشتی اور ان کے رفقاء نے ایک بڑے سیمنار کا انعقاد اجمیر شریف میں کیا تھا جس میں ہر مذہب و ملّت کے اہلِ علم اور بہت سے مشہور مشائخ نے شرکت کی تھی۔ اس سیمنار میں فاروقی صاحب کا یہ مقالہ اتنا پسند کیا گیا کہ بعد میں اسے متعدّد مقامات پر پڑھوایا گیا اور پھر رسالہ "اسلام اور عصرِ جدید" میں اس کی اشاعت عمل میں آئی اور اب علیٰحدہ رسالے کی صورت میں بھی اسے شائع کیا جا رہا ہے۔

زیرِ نظر مقالہ محض آرام کرسی والے مطالعے کی چیز نہیں ہے۔ اس کی حیثیت ایک ایسی بنیاد کی ہے جس پر فلک بوس عمارت تعمیر کی جا سکتی ہے اور مجھے اُمید ہے کہ خُدا نے چاہا تو چشتی خانقاہوں کی حیاتِ نَو میں جو نئے مرکز جگہ جگہ قائم ہوں گے، جو تحریکیں اُٹھیں گی، تعلیم و تربیت کے جو ادارے وجود میں آئیں گے، جو مشنری چشتی بزرگوں کا پیغام لے کر دُنیا میں پھیلیں گے، ان کے لیے یہ مقالہ ایک بنیادی یادداشت ایک ریفرنس ایک بریف اور ایک طرح کے چارٹر کا کام دے گا۔ اور اِس کی روشنی میں بڑے بڑے یادگار تاریخی کام کیے جائیں گے۔ شاید میری یہ بات اِس وقت مبالغہ آمیز سمجھی جائے لیکن وقت ان شاء اللہ بتائے گا کہ اس میں ذرا بھی مبالغہ نہیں تھا۔ کیونکہ مجھے اس مقالے کی حیثیت انجینیرنگ کے اُس کارنامے کی سی نظر آتی ہے جو رحمت الٰہی کی برسات میں پانی کو بکھرنے اور ضائع جانے سے بچاتا ہے اور بندھ باندھ کر نہریں نکال کر دور دور کی پیاسی زمینوں کو سیراب اور شاداب کرنے کا سامان کر دیتا ہے۔ چشتی تعلیمات ملفوظات، تذکروں اور تاریخوں میں موجود اور محفوظ ضرور ہیں لیکن اس طرح بکھری ہوئی ہیں کہ ہر ایک کے لیے اُن کا احاطہ کرنا اور اُن سے کماحقہٗ فائدہ

اُٹھانا ممکن نہیں ہے۔ فاروقی صاحب نے اپنے وسیع مطالعے، خاندانی روایات اور دردمندی سے کام لے کر چشتی تعلیمات کو جس طرح سمیٹا ہے اور عہد حاضر میں اُن کی معنویت سے جس طرح آگاہ کیا ہے، وہ اُنہی کا حصّہ ہے۔

تاریخ گواہ ہے کہ برصغیر ہند و پاک کے مخصوص مزاج کو چشتی تعلیمات جتنی موافق آئیں اور کوئی تعلیم اتنی موافق نہیں آئی۔ موجودہ دَور کے انتشار، بے چینی اور گمراہی کو بھی ان شاء اللہ صوفی تعلیمات، خاص کر چشتی تعلیمات سے دور کیا جا سکے گا۔ نئے دن کو جو گہن لگا ہے اس میں امید کی کرن صوفی نظام تعلیم و تربیت ہی میں نظر آتی ہے۔ خدا کرے یہ گہن جلد دور ہو۔ اندھیرے چھٹیں اور خود شناسی اور خدا شناسی اور انسان دوستی کی روشنی ایک دفعہ پھر پھیل جائے۔ اللہ تعالےٰ ڈاکٹر نثار احمد فاروقی صاحب کو جزائے خیر دے۔ انھوں نے بڑا کام کیا ہے کاش کہ ان کا یہ رسالہ اُردو کے علاوہ ہندوستان کی دوسری زبانوں میں بھی شائع ہو سکے اور ہر جگہ پہنچ سکے۔ اس رسالے کو پڑھنے والے خود بھی اس سے پورا فائدہ اُٹھائیں اور یہ کوشش بھی کریں کہ ہمارے دوسرے بھائی، ہمارے ہم وطن بھی چشتی سلسلے کی تعلیمات اور اُن کی معنویت سے واقف ہوں اور انسانیت کا درد ہم سب کا درد بن کر ایک دوا ہو جائے!

(خواجہ) حسن ثانی نظامی

حجرۂ قدیم
درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیا محبوب الٰہیؒ
نئی دہلی ۱۳
۲۵ر محرّم ۱۴۰۱ھ (۴ر دسمبر ۱۹۸۰ء)

پیش لفظ

ہمارے عہد میں ایک صحت مند انسانی دماغ کی سب سے شدید اور گہری آرزو امن و آشتی کی ہے جس سے ایسا ماحول پیدا ہو سکے جس میں انسان کی جسمانی اور روحانی صلاحیتوں کی بھرپور نشو و نما ہو تاکہ وہ زندگی کے اس مقصدِ اصلی کو سمجھنے کے قابل ہو سکے جسے روحانیت کی زبان میں نجات، موکش، SALVATION نروان یا آنند کہا جاتا ہے۔

ہزاروں سال سے مذہب نے کبھی وحی الٰہی کی روشنی میں اور کبھی انسان کے اپنے نورِ باطن کے سہارے سے اس مقصد کو حاصل کرنے کی لگاتار کوشش کی ہے لیکن یہ مذہبی کوششیں بنی نوع انسان کے ظاہر یا باطن کو

جو کچھ دے سکیں، اس سے نا آسودہ ہو کر انسان کا دماغ، خاص طور سے مغربی ممالک میں، سائنس اور عقلی دلیل کی طرف راغب ہوا کہ شاید یہ اُس مقصد کے حصول کے لیے زیادہ بامعنی ذرائع ثابت ہو سکیں۔ لیکن پچھلے سو برس کے تجربوں نے تمام ذی شعور اور حسّاس انسانوں کو یہ باور کرا دیا کہ ہر چند سائنس نے دلیل اور منطق کی روشنی میں بہت سے مفید اور مثبت نتائج برآمد کیے ہیں لیکن ان میں سے بعض کے بالواسطہ یا بلاواسطہ منفی اثرات نے نوع انسانی کو اس کے خوابوں کی منزل سے یقیناً دور کر دیا ہے اور اُسے نہ صرف روحانی اور اخلاقی دوالیہ پن کے دہانے تک لے آئے ہیں بلکہ ساری نوع انسانی کی جسمانی ہلاکت کے سامان مہیّا کر دیے ہیں۔

اس خطرناک صورت حالات نے بہتوں کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا ہے کہ مذہب اور عقیدے کو ایک رہنما قوت کی حیثیت سے ردّ کرنے میں انھوں نے شاید عجلت سے کام لیا تھا جو بنی نوع بشر کے مقاصد اور تمنّاؤں کے حصول میں سب سے زیادہ معاون ہو سکتی تھی۔ سوال یہ ہے کہ ہماری تاریخ کے ابتدائی دور میں کیا تمام بڑے عالمی مذاہب نے اپنے اپنے دائرۂ اثر میں انسان کو اُن مقاصد کے حصول میں مدد نہیں دی تھی، جن کے لیے وہ جدّوجہد کر رہے تھے؟

یہ عقیدہ رکھتے ہوئے کہ عصر جدید کے انسان کا مذہب کی حقیقی معنویت میں اعتقاد دنیا کو ہلاکت سے بچانے کا واحد راستہ ہے، اور یہ اسی وقت بحال کیا جا سکتا ہے جب بڑے عالمی مذاہب کی تعلیمات کو ان کے سامنے عقل اور

منطق کی روشنی میں پیش کیا جائے جس میں آزادیِ فکر کے ساتھ آفاقی اپیل کا لحاظ بھی رکھا گیا ہو۔ اسلام اینڈ دی ماڈرن ایج سوسائٹی نے ایک ایسے سلسلۂ مطبوعات کا آغاز کیا جس میں اسلام، ہندو مت، بدھ مت، عیسائیت وغیرہ کی تعلیمات پر اسی مذہب کے ممتاز علماء سے کتابیں آسان اور عام فہم اسلوب میں لکھوائی جائیں تاکہ اوسط درجے کا تعلیم یافتہ بھی انھیں پڑھ کر ان مذاہب کے اخلاقی اور روحانی اصولوں کو آسانی سے سمجھ سکے اور یہ جان سکے کہ ماضی میں انھوں نے ہماری سائنس اور تہذیب کو کیا دیا ہے اور آج عصرِ جدید کے تقاضوں کو پورا کرنے کے کتنے امکانات ان مذاہب کی تعلیمات میں پوشیدہ ہیں تاکہ عقل اور عقیدے میں ہم آہنگی پیدا ہو اور ان کے عمل باہم سے شک اور دہریت کے حملوں سے مذہب کو بچایا جاسکے۔ نہ صرف یہ بلکہ جدید ٹکنالوجی کی بے لگام نشو ونما اور غیر معمولی قوت جو آج سارے انسانی معاشرے کو سطحِ زمین سے نابود کرنے کی دھمکی دے رہی ہے، اس پر عقیدے کی قوت سے لگام لگائی جاسکے اور اس کا رُخ تعمیری اخلاقی مقاصد کے حصول کی طرف موڑا جاسکے۔

ان کتابوں کا ایک اور بڑا مقصد یہ بھی ہے کہ دنیا کے بڑے مذاہب کے ہمدردانہ تقابلی مطالعے سے ان مذاہب کے ماننے والوں میں خود اپنے مذہب کی زیادہ گہری واقفیت اور دوسرے عقائد سے صحت مند مفاہمت کا دروازہ کھل سکے کیونکہ ایک انگریزی مقولے کے مطابق "جو صرف اپنے مذہب کی واقفیت رکھتا ہے وہ اپنے مذہب کو بھی نہیں جانتا۔"

پروفیسر نثار احمد فاروقی کی یہ کتاب "چشتی تعلیمات اور عصرِ حاضر میں ان کی معنویت" بھی اسی مقصد کی تکمیل کرتی ہے۔ اس میں اسلام کے ایک روحانی پہلو کے بارے میں اولین اور مستند مآخذ سے، اختصار اور جامعیت کے ساتھ کچھ اصولی باتیں بیان کی گئی ہیں۔ اسلامی تصوّف، اس کی روح، طریق کار، دائرۂ اثر و نفوذ اور اس کے تعمیری پہلوؤں کو سمجھنے میں یہ مختصر کتاب بہت مدد دے گی اور تصوّفِ اسلامی کے بارے میں بہت سی غلط فہمیوں کا ازالہ کرے گی۔

بشیر حسین زیدی
نائب صدر
اسلام اینڈ دی ماڈرن ایج سوسائٹی
نئی دہلی ۲۵

۲۸۔ شوال سنہ ۱۴۰۰ھ
۹۔ ستمبر سنہ ۱۹۸۰ء

(الف) چشتی تعلیمات کا مقصد

ہندستان میں تصوّف کے کئی خانوادے سرگرم عمل رہے ہیں مگر سب سے زیادہ اثر و نفوذ چشتی سلسلے کو حاصل رہا ہے۔ چھٹی صدی ہجری میں حضرت سلطان الہند خواجہ معین الدین چشتی غریب نواز رحمۃ اللہ علیہ (ف ۶۳۴ھ) کے قدومِ مبارک کے ساتھ یہ فیضان اِس سرزمین میں آیا تھا اور اُس زمانے سے آج تک سلسلۂ چشتیہ میں باکمال بزرگوں کا ظہور ہوتا رہا ہے۔

اخلاقی زندگی کے دو پہلو ہیں اور اسلام کے مشن کا خلاصہ بھی یہی دو لفظ ہیں: "تحسینُ علاقۃِ الانسانِ باللہ" (انسان کا اپنے اللہ سے بہتر رشتہ قائم کرنا) اور "تحسینُ علاقۃِ الانسانِ بالانسانِ" (ایک انسان کا دوسرے انسان سے بہتر رشتہ قائم کرنا۔) ایک پہلو سے حقوق اللہ کے ادا کرنے کی تاکید ہے اور دوسری شق میں

حقوق العباد سے عہدہ برآ ہونے کی۔

چشتی صوفیاے کرام نے اپنی خانقاہوں کا تربیتی نظام اِسی اُصول کے تحت بنایا تھا[1] کہ عوام کو اخلاقی درس کتابوں سے نہیں "عمل" سے دیا جائے۔ چنانچہ حضرت محبوب الٰہی نے فرمایا ہے کہ علما، جو کچھ زبان سے کہا کرتے ہیں مشائخ اسی کو عمل میں "دکھاتے" ہیں[2] یعنی پند و نصیحت "لسانِ حال" سے مؤثّر ہوتی ہے۔ لسانِ حال نہ ہو تو لسانِ قال سے کچھ نہیں ہوتا۔[3] قرآن نے اِسی بات کو یوں کہا ہے:

مَثَلُ الَّذِیْنَ حُمِّلُوا التَّوْرَاۃَ ثُمَّ لَمْ یَحْمِلُوْھَا کَمَثَلِ الْحِمَارِ یَحْمِلُ أَسْفَارًا (سورۂ جمعہ)

(ترجمہ: وہ لوگ جنھیں توراۃ دی گئی اور انھوں نے اُس پر عمل نہیں کیا، اُن کی مثال اُس گدھے کی سی ہے جس پر کتابیں لدی ہوتی ہیں۔

(تفسیر الطبری ۲۸ : ۹۷)

شیخ سعدی کے لفظوں میں:

علم ہر چند بیشتر خوانی — چوں عمل در تو نیست نادانی
نہ محقّق بود نہ دانشمند — چارپایے بر و کتابے چند

اِس لحاظ سے تصوّف کی روح عین اسلام کی روح ہے۔ حضور نے فرمایا ہے:

بُعِثْتُ لِأُتَمِّمَ مکارِمَ الأَخْلاقِ (میں مکارمِ اخلاق کی تکمیل کے لیے مبعوث کیا گیا ہوں۔)

یہ مکارمِ اخلاق کیا ہیں؟ علماء اِن سے "واقف" ہیں اور صوفیا اِن کے "حامل"

ہیں شیخ ابوسعید ابوالخیر کا لطیفہ فوائد الفواد[4] میں ہے کہ بوعلی سینا اُن سے مل کر گئے تو کسی نے پوچھا کہ اِن کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ شیخ نے کہا: "مکارمِ اخلاق ندارد"۔ بوعلی سینا کو بھی خبر لگ گئی۔ اُنھوں نے کہا کہ میں نے مکارمِ اخلاق کے موضوع پر پوری ایک کتاب تصنیف کی ہے۔ شیخ ابوالخیر نے فرمایا: "میں نے یہ کب کہا تھا کہ مکارمِ اخلاق نداند — یہ کہا تھا کہ مکارم اخلاق ندارد"۔

جو علم مدرسوں میں پڑھایا جاتا ہے وہ کیا ہے: نظریات، مباحث، اشکال، قواعد، صرف، نحو، تاویل، کلام — مگر یہ سب علم کا "ظاہر" ہے جسے صوفیا "حجاب" کہتے ہیں[5]۔ پھر اس کا "باطن" کیا ہے؟ باطن وہ ہے جسے صوفیا "عشق" کہتے ہیں۔ "علماء اہلِ عقل اند و درویشان اہلِ عشق[6]"۔ چنانچہ

عشق را بوحنیفہ درس نگفت
شافعی را در و روایت نیست[7]

یہ علم کے مقابلے میں عمل[8] ہے، عقل کے مقابلے میں جذبہ ہے — یہی دین کا قلب ہے، روح ہے، اساس اور غایت ہے۔ یہ علم ظاہر سے کہیں اعلیٰ و افضل ہے۔ امام غزالی نے مدرسۂ نظامیہ بغداد کی ملازمت سے استعفا دے کر راہِ سلوک طے کی تھی اور اپنے تجربات کا خلاصہ اِن الفاظ میں پیش کیا ہے:

إنَّ الصُّوفيةَ هُم السَّالكونَ لطريقِ اللهِ تعالىٰ خاصةً وأنَّ سيرتَهم أحسنُ السيرِ وطريقَهم أصوبُ الطرقِ وأخلاقَهم أزكى	صوفیاے کرام خاص طور سے اللہ کے راستے پر چلنے والے ہیں اور اُن کی سیرت سب سے اچھی اور اُن کا راستہ سب سے سیدھا اور اُن کے اخلاق بہترین اخلاق

الأخلاقِ بل لو جمع عقلُ العقلاء و حکمۃُ الحکماءِ وعلمُ الواقفین علی أسرارِ الشرعِ من العلماء لیغیّروا شیئاً من سیرِہم وأخلاقِہم ویُبدّلوہ بما ھُوخیرٌ منہ لم یجدُوا إلیہِ سبیلا۔ فانَّ جمیعَ حرکاتہم وسکناتِہم فی ظاہرِہم و باطنہم مقتبسۃٌ من نورِ مشکوۃ النبوّۃ ولیس وراءَ نورِ النبوۃِ علی وَجْہ الأرضِ نورٌ یُستَضاءُ بہٖ۔"[9]

ہیں بلکہ اگر سارے دانشمندوں کی عقل اور فلسفیوں کا فلسفہ اور اسرارِ شرع کے جاننے والے علماء کا علم جمع کرلیا جائے تاکہ اُن کی سیرت یا اخلاق میں کچھ تبدیلی کردیں یا اُسے بہتر چیز سے بدل دیں تو انھیں اس کی گنجایش نہیں ملے گی کیونکہ اُن کی سب حرکات و سکنات، ظاہر میں اور باطن میں چراغِ نبوّت کے نور سے حاصل کی گئی ہیں اور روے زمین پر نورِ نبوّت کے سوا اور کوئی نور ایسا نہیں ہے جس سے روشنی اخذ کی جا سکتی ہو۔

اسی لیے مدرسے میں پڑھائے جانے والے علوم کے لیے اصطلاح "علوم ظاہر" کی اور خانقاہ میں دکھائے جانے والے عمل کے لیے "علومِ باطن" کی استعمال ہوتی ہے۔ حضرت نظام الدینؒ نے فرمایا کہ جب کوئی علم حاصل کرتا ہے تو اسے ایک شرف نصیب ہوتا ہے اور عبادت کرتا ہے تو صلاح ملتی ہے۔ یہاں شیخ کی ضرورت ہے "تا ہر دو را بشکند یعنی علم و عمل را از نظرِ او فرود آرد تا بعجب مبتلا نشود"[10]

اِس مدرسۂ عشق میں داخلے کا اصطلاحی نام 'ارادت' یا بیعت ہے۔ اور طالب علم کو "مرید" کہتے ہیں۔ "بیعت" ایک عام اصطلاح ہے۔ یہ ایک معاہدہ

یا اقرار ہے جو پیر کے ہاتھ پر ہوتا ہے مگر " آن عہد[11] بہ خدا وند است " اور یہ کسی بھی مقصد کے لیے ہوسکتا ہے جیسے بیعت توبہ، بیعتِ جہاد، بیعتِ خلافت وغیرہ ۔ مگر ارادت بقول علّامہ عبدالکریم قُشیری (متوفی ۴۶۵ھ) نُہوضُ القلبِ فی طَلبِ اللہ (طلب خدا میں دل کا بیدار ہونا) ہے۔ اور اِس کا مفہوم اتنا عام نہیں ہے۔ "مرید" کے معنی ہیں ارادۂ شیخ کو اپنا ارادہ بنا لینے والا ۔ اِسے " وحدتِ مطلب " بھی کہتے ہیں[12]۔ حافظ نے کہا ہے :

بمے سجّادہ رنگیں کُن گرت پیرِ مُغاں گوید
کہ سالک بے خبر نبود ز راہ و رسمِ منزلہا

یہاں نہ چون وچرا ہے ، نہ منطق اور استدلال؛ بلکہ مکمل تسلیم اور سپردگی ہے کیونکہ محبت ہی مایۂ درویشی ہے اور محبّت کا اقتضاء متابعتِ کاملہ ہے[13]۔

" ہرچہ پیر فرماید مرید را باید کہ ہمان بکند[14]۔" یعنی پیر کو اپنا حاکمِ مطلق بنالیا جائے مگر " سالکِ بے خبر نبود " میں یہ نکتہ بھی پوشیدہ ہے کہ پیر کا حالتِ صحو میں اور عالم شرع ہونا ضروری ہے تاکہ وہ نامشروع باتوں کا حکم نہ دے[15]۔ حضرت چراغ دہلیؒ نے بڑی قیمتی بات کہی ہے۔ اُنھوں نے فرمایا کہ اگر کوئی مقامِ حقیقت سے گرے گا تو طریقت میں رہے گا، طریقت سے ساقط ہوگا تو بارے شریعت میں رہے گا لیکن اگر شریعت سے بھی پانْو پھسلا تو اُس کا ٹھکانا کہاں ہے ؟ ایک شخص حضرت چراغ دہلیؒ کا مرید ہوا اور آپ سے وصیّت طلب کی۔ فرمایا " وصیّت ہمین است کہ انچہ خدا و رسولِ خدا منع کردہ است آن نکنی[16]۔"

ارادت دو طرح کی ہوتی ہے : ایک رسمی، دوسری حقیقی ۔ رسمی تو یہ ہے کہ

مرید کو نیک کاموں کی تلقین کر دی جائے، یا کچھ اوراد و وظائف بتا دیے جائیں وغیرہ، اور حقیقی ارادت یہ ہے کہ مرید ہمہ وقت شیخ کی خدمت میں رہے یا شیخ اُس کے ساتھ رہے۔[17] "تصوّرِ شیخ" کا جواز یہیں سے سمجھ میں آسکتا ہے۔ جہاں پیر جسمانی طور پر موجود نہ ہو وہاں اُسے "روحانی" طور پر شاہد سمجھا جائے۔[18] شیخ اپنے مرید کے احوال کی نگرانی کس طرح کرتا ہے، اس کا ایک واقعہ فوائد الفواد میں موجود ہے۔[19]

پیر کی ذمّہ داری بھی کسی طرح کم نہیں ہے۔ اُسے مرید کے اعمال کا نگراں بنایا گیا ہے تو "ہر چہ آن مرید کند فردا آن عمل در پلّۂ پیرِ او نہند"[20] (جو کچھ وہ کرتا ہے، قیامت کے دن اُس کا عمل پیر کے پلّے میں رکھا جائے گا۔)

اِسی ذمّہ داری کی وجہ سے ارادت کا عالمِ ظاہر میں اور شیخ کا بقیدِ حیات ہونا ضروری ہے۔ حضرت بابا فرید گنج شکرؒ کے ایک صاحبزادے نے دہلی آکر حضرت خواجہ قطب الدّین بختیار کاکی علیہ الرحمۃ کے مزار سے بیعت کر لی تھی۔ بابا صاحبؒ کو اِس کا علم ہوا تو اُنھوں نے فرمایا کہ قطب صاحب میرے شیخ ہیں، اُن کا احترام اور محبّت بجا ہے مگر بیعت کا عالمِ ظاہر میں ہونا ضروری ہے۔ مزار سے نہیں ہو سکتی۔[21]

ارادت کا اظہار کرنے پر ایک انسان خانقاہی نظامِ تربیت سے متعلّق ہو جاتا ہے۔ گویا اُس نے ایک ایسی یونیورسٹی میں داخلہ لیا ہے جہاں کتابی علم نہیں بلکہ کتابی عمل پڑھایا بلکہ کر کے دکھایا جائے گا اور اس نصاب کی تکمیل کے بعد اُسے سندِ فراغ ملے گی جسے صوفیا کی اصطلاح میں "اجازت نامہ" کہتے ہیں۔

یونیورسٹی میں آج بھی فارغ التحصیل طلبہ کو سند دیتے وقت گاؤن (GOWN) اور ہُڈ (HOOD) پہنایا جاتا ہے۔ خانقاہ کا گاؤن خرقہ ہے اور ہُڈ کلاہِ نمد یا "کلاہِ چہار ترکی" ہے۔[۲۲] یہ گاؤن تو آج یونیورسٹیوں میں ہر سال لاکھوں طالب علم پہن کر سند لیتے ہیں مگر مشائخ کا خرقہ کتنی کڑی شرائط کے ساتھ ملتا ہے اِس کا اندازہ اس واقعہ سے ہوسکتا ہے کہ بداؤں کے ایک شخص عزیز بشیر دہلی آئے تاکہ قاضی حمیدالدین ناگوری کے فرزند مولانا ناصح الدین ناگوری سے خرقہ حاصل کریں۔ یہاں حوض شمسی کو دیکھ کر اُنھوں نے کہا کہ بداؤں میں جو "حوضِ ساغر" ہے وہ اس سے بڑی ہے۔ اس وقت شیخ محمد کبیر بھی موجود تھے۔ اُنھوں نے مولانا ناصح الدین سے کہا کہ یہ شخص "گزاف گو" ہے اِسے خرقہ نہ دیا جائے۔[۲۳]

چشتی ملفوظات میں بار بار اِس کا اعادہ کیا گیا ہے کہ خرقہ "پردہ پوشی" کی علامت ہے جو حق تعالیٰ کی صفت ہے۔[۲۴] درویش کو اِس صفت کی بہت ضرورت ہے کیونکہ وہ نفس اور قلب کے امراض کا طبیب ہوتا ہے۔ اُسے نفس کی بیماریوں کا اُسی طرح علم ہوتا ہے جیسے امراضِ جسمانی کی کیفیت کا کسی معالج کو ہونا چاہیے۔

(ب) خانقاہی تربیت کا نصاب

اب نصابِ تربیت ملاحظہ فرمایئے: یہ ایسے اصولوں پر بنایا گیا ہے کہ مرید کی شخصیت کو خاص نظم کے ساتھ بتدریج تعمیر کرتا رہے۔ انسان کو "حیوانِ ناطق" کہا جاتا ہے اور اکثر حالات میں صرف "نُطق" ہی اُسے حیوانوں سے ممتاز کرنے والا رہ گیا ہے۔ اگرچہ اِس نُطق سے بھی وہ وہ آفتیں آتی ہیں کہ "در گفتن نمی آید۔۔۔۔"

(۱) نفس کُشی :

بہیمیّت انسان کی جبلّت ہے جو بدلتی نہیں، پوشیدہ ضرور ہو جاتی ہے۔ اُس پر تہذیب و شایستگی یا تصنّع اور منافقت کے پردے پڑ جاتے ہیں، تہذیب بھی کیا ہے بقول برنارڈ شا :

THE MORE YOU ARE ASHAMED OF DOING A THING THE MORE YOU ARE CIVILIZED.

مگر جو ظلم اور بہیمیّت سرشت میں ہو وہ بار بار سر ضرور اُٹھائے گی۔ (بقول المتنبّی) :

الظُّلمُ مِنْ شِیَمِ النُّفُوسِ فَاِنْ تَجِدْ
ذَاعِفَّةٍ فَلِعِلَّةٍ لَا یَظْلِمَ

یعنی ظلم انسان کے خمیر میں شامل ہے اگر تم کسی کو عفت مآب دیکھو تو سمجھ لو کہ اُس کے ساتھ ظلم نہ کرنے کی کوئی علّت وابستہ ہے۔ وہ دُور ہو جائے گی تو یہ بھی ظلم کرے گا۔ آخری سند تو قرآن نے دے دی ہے : ظَلُوماً جَہُولا۔ دونوں صیغے مبالغے کے۔

چشتی نظام تربیّت میں پہلا وار نفس پر ہوتا ہے جو ظلم اور تعدّی، جہالت اور بربریّت کا مکمن و مامن ہے۔ نفس کو جتنا زیادہ شکستہ اور مغلوب و مقہور کرنا ہو، اُتنی ہی کڑی ریاضتیں اور مجاہدے تجویز کیے جاتے ہیں کیونکہ اِس طرح جو اخلاق پیدا کرنا مقصود ہے وہ کسب اور مجاہدہ سے ہی تعلّق رکھتا ہے۔[۲۵]

یہ اعتراض کہ اسلام میں ایسی "تکلیفِ مالا یُطاق" نہیں ہے۔ درست

ہے۔ مگر اِس کا وجوب نہیں ہے، رخصت ہے۔ نفس کُشی کے لیے مجاہدہ کو کہیں حرام بھی نہیں کہا گیا ہے اور اِس نفس کُشی کا مقصد و غایت بھی اخلاقِ ذمیمہ سے طہارت حاصل کرنا ہے۔ یہ مقصود بالذات نہیں ہے۔[۲۶]

بلکہ حضرت چراغ دہلیؒ نے مجاہدات کا جواز بار بار قرآن شریف کی یہ آیت پڑھ کر ثابت کیا ہے :

وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا — جو لوگ ہماری راہ میں مجاہدہ کرتے ہیں ہم اُنھیں اپنے راستے دکھادیں گے۔

صوفیاء اس کی تشریح یوں کرتے ہیں کہ " وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا " شرط ہے اور لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا اس کی جزا ہے۔ جزا بغیر شرط کے نہیں ہوتی، لہذا ہدایت بے مجاہدہ نہیں مل سکتی۔[۲۷] یہیں سے وسعتِ مشرب کا جواز بھی ملتا ہے کہ اس آیۃ میں " سُبُلَنَا " (ہمارے راستے) کہا ہے " سبیلَنا " (ہمارا راستہ) نہیں کہا۔[۲۸]

نفس کو مغلوب کرنے کے لیے سب سے زیادہ توجہ انکسار، فروتنی اور دوسروں کو اپنے سے بہتر جاننے پر درکار ہے۔ تجرّد اگر نظامِ اخلاق میں کمزوری پیدا نہ کرے تو اُس کی اجازت دی گئی ہے[۲۹] ورنہ تاہّل کا حکم ہے۔ مگر اس بارے میں حضرت نظام الدین اولیاؒ نے بڑا لطیف نکتہ بیان کیا ہے۔ فرمایا کہ صبر کے تین درجے ہیں ایک تو الصَّبْرُ عَنْهُنَّ ــ یعنی مجرّد رہے اور صبر کرے۔ دوسرے الصَّبْرُ عَلَيْهِنَّ یعنی شادی کرے اور اہل وعیال سے جو سختیاں اور نامرضیات ظہور میں آئیں اُنھیں جھیلے۔ تیسرے اَلصَّبْرُ عَلَى النَّارِ یعنی اُنھیں ایذا دے یا اُن کے حقوق ادا نہ کرے تو نارِ جہنّم پر صبر کرے۔[۳۰]

قلّتِ طعام، قلّتِ کلام، قلّتِ مَنام اور قلّۃ الصّحبۃ معَ الاَنام[۳۱]۔ یہ سلوک کے چار بنیادی اصول ہیں مگر وظیفۂ رجولیت میں قلّت کو صوفیاء نے مجاہدات میں شامل نہیں کیا ہے کیونکہ یہ نفس کو زیر کرنے کا 'غیر فطری' طریقہ ہوگا۔

مجاہدات سے نفس قابو میں آجائے تو سالک میں وہ قوّتِ مدافعت بالکل نہیں رہتی جو نفس کے مقابلے اور مکابرے میں نفس کو اُبھارتی ہے اور برائی کو برائی سے ختم کرنا چاہتی ہے۔ نہ وہ "انانیت" رہے گی جو دوسروں پر جارحانہ حملے کرتی ہے یا اَوروں کا حق خود چھیننا چاہتی ہے جس سے مکر و دغل، حرص و ہوا اور کبر و حسد کے امراض پیدا ہوتے ہیں۔ چنانچہ محبوب الٰہیؒ نے فرمایا کہ جب کوئی "نفس" سے پیش آئے تو درویش کو "قلب" سے پیش آنا چاہیے کیونکہ نفس میں خصومت، غوغا اور فتنہ ہے اور قلب میں سکون و رِضا اور مُلاطَفت۔ اِس طرح نفس خود مغلوب ہوجائے گا۔[۳۲] چراغ دہلیؒ نے فرمایا: "اگر ایشان جفا ہا می کنند شما درویشی کنید بخشندہ باشید۔"[۳۳] حضرت بابا فریدؒ کا قول ہے کہ "کَشِندہ کُشندہ باشد" یعنی جھیلنے والا دشمن کو ختم کرنے والا ہوتا ہے۔[۳۴]

نفس کی لگام ہاتھ میں آجائے تو سالک کے لیے دو تربیتی کورس ساتھ ساتھ چلتے ہیں: پہلا حسنِ معاملہ با خَلق' اور دوسرا ترکِ ماسویٰ اللہ۔[۳۵] پہلے نصاب کا تعلق حقوق العباد کے پورا پورا ادا کرنے سے ہے اور دوسرے کا حقوق اللہ کی رعایت کرنے سے۔[۳۶]

چشتی تعلیمات میں اِن دونوں پہلوؤں کو مساوی اہمیّت دی گئی ہے۔ "حسنِ معاملہ با خَلق" کا اعلیٰ ترین معیار یہ ہے کہ اپنے دوستوں کے ساتھ تو سب ہی

اچھا سلوک کرتے ہیں، دشمنوں سے بھی نیکی، نرمی اور رافت کا برتاؤ کیا جائے۔[۳۷]
چنانچہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کو باباصاحبؒ نے پہلا سبق یہی دیا تھا کہ "اپنے دشمنوں کو خوش کرنا چاہیے"[۳۸] اور حضرت محبوب الٰہیؒ اکثر یہ اشعار پڑھا کرتے تھے۔[۳۹]

"ہر کہ مارا یار نبود، ایزد او را یار باد
و انکہ مارا رنجہ دارد راحتش بسیار باد
ہر کہ او خارے نہد در راہِ ما از دشمنی
ہر گلے کز باغِ عمرش بشگفد بے خار باد"

حضرت چراغ دہلیؒ پر جب تراب قلندر نے حملہ کیا اور چاقو سے نوزخم جسمِ مبارک پر لگائے تو جخرے سے خون بہتا ہوا نالی کے راستے سے باہر جانے لگا تھا۔ آپ لہولہان ہو چکے تھے۔ خدام نے دوڑ کر قلندر کو پکڑ لیا مگر اِس سے پہلے کہ اُسے کوئی سزا دیں، حضرت چراغ دہلیؒ نے سختی سے تاکید کر دی کہ اِسے کوئی تکلیف نہ دی جائے۔ میں نے اِسے معاف کر دیا ہے بلکہ اُسے کچھ چاندی کے سکّے بھی مرحمت فرمائے۔[۴۰] اِسی لیے کہا جاتا ہے کہ "مالِ صوفی سبیل اور اُس کا خون مُباح ہے"۔[۴۱]

حضرت محبوب الٰہیؒ سے ایک شخص نے عرض کیا کہ کچھ لوگ آپ کو برسرِ منبر بُرا کہتے ہیں اور دوسرے مواقع پر بھی نہیں چوکتے۔ ہم سے یہ سُنا نہیں جاتا۔ آپ نے فرمایا:

"من از ہمہ عفو کردم ... شمارا ہم می باید — میں نے سب کو معاف کر دیا ہے ...

کہ عفو کنید....."[42] تمھیں بھی معاف کر دینا چاہیے۔

اور فرمایا کہ بُرا کہنا تو آسان ہے بُرا چاہنا اُس سے بھی بدتر ہے اور عداوت کا علاج یہ تجویز کیا کہ ایک فریق اپنا دل صاف کر لے دوسرے کا آزار خود کم ہو جائے گا۔

حضرت نے فرمایا کہ خَلق سے معاملہ تین طرح کا ہوتا ہے" ایک تو وہ شخص ہے جس سے نہ نفع پہنچتا ہے نہ نقصان۔ یہ جمادات کے حکم میں ہے۔ دوسرا وہ ہے جس سے لوگوں کو نفع ہوتا ہے، نقصان نہیں ہوتا۔ مگر اُس سے افضل وہ ہے جس سے نفع ہوتا ہے اور جب اُسے کوئی نقصان پہنچاتا ہے تو وہ بدلہ نہیں لیتا۔ یہ درجہ صدّیقوں کا ہے"[43]

ظاہر ہے جہاں دشمنوں سے ایسا سلوک ہوگا وہاں دوستوں، عزیزوں اور رشتہ داروں کے حقوق کے ادا کرنے میں کیا کمی ہو سکتی ہے اور حقوق کو سمجھنے کا بہترین معیار یہ ہے کہ " انچہ برخود روا نداری برغیرے روا مدار"[44] یعنی

کبھی بھول کر کسی سے نہ کرو سلوک ایسا
کہ جو تم سے کوئی کرتا، تمھیں ناگوار ہوتا

(۲) ترکِ دُنیا

دوسرا انصاب ترکِ ماسوی اللہ کا ہے۔ چشتی بزرگ اپنے مریدوں کو داخلِ سلسلہ کرتے ہوئے بطور علامت اُن کا سر منڈواتے تھے۔[45] یہ دنیا کی آلایش دُور کرنے کی نشانی تھی۔[46] پھر اُس کی آستینیں قطع کراتے تھے، یہ زہد کی علامت تھی۔ پھر اُنھیں کلاہ چہار ترکی دی جاتی تھی، یہ چوگوشیہ ٹوپی تھی جس کے

چار زاویے یہ تھے : ترکِ دنیا ، ترکِ عقبیٰ ، ترکِ مَولیٰ ، ترکِ ترک ۔

ترکِ دنیا کا مفہوم بعد کو غلو کرنے والوں یا صوفیا کے معاندوں نے کچھ کا کچھ کر دیا۔ یہ منفی اور فراری رویّہ نہیں تھا بلکہ اِس کی اساس قرآن کے اِس حکم پر ہے کہ " اِنَّمَا الدُّنْیَا لَھْوٌ وَّلَعِبٌ " لَہو ہر اُس شے کو کہتے ہیں جس میں انسان کھو جائے اور لَعِبْ بے نتیجہ کام ، محض کھیل اور دل لگی ۔ دنیا کی یہی دو خصوصیات ہیں کہ وہ خدا ، آخرت اور ایمان سے غافل کر دیتی ہے اور اُس کی رنگینیوں میں انسان کھو جاتا ہے ، یہ فقہی اصطلاح میں " حکمتِ حَظَر " ہوئی ۔ جیسے شراب کے حرام ہونے کی علّت سُکر ہے ۔ وہ رفع ہو جائے تو حرمت خود بخود اُٹھ جائے گی ۔ اِسی طرح دنیا کے مکروہ و مبغوض ہونے کا سبب اُس کا لَہو و لعِبْ ہونا ہے ۔ اگر دنیا کی اِس خصوصیت سے کوئی دامن بچا سکے تو اُس کے لیے دنیا حلال ہے ۔ یہی مولانا روم نے فرمایا ہے

چیست دنیا از خدا غافل بُدن
نے قماش و نُقرہ و فرزند و زن

حضرت امام محمد باقرؒ نے بھی آیۂ کریمہ فَمَنْ یَّکْفُرْ بِالطَّاغُوْت کی تفسیر کرتے ہوئے " طاغوت " کے معنی یہ فرمائے کہ جو تمھیں خدا سے غافل کرے وہ تمھارا طاغوت ہے ۔[۴۷]

صوفیائے چشتیہ[۴۸] کے کلام میں دُنیا کی مذمّت اِسی قدر ہے ۔ یہ نہیں ہے کہ سالک شادی نہ کرے ، صاحبِ اولاد نہ ہو ، گھر بار کی ذمّہ داریاں یا پیشے[۴۹] ، حرفتیں اور دستکاریاں نہ ہوں یا دنیا سے جائز تمتّع ممنوع کر دیا ہو ۔ بلکہ حضرت محبوب الٰہیؒ کا

ارشاد ہے: ترکِ دنیا یہ ہے کہ کھائے پیے، کھلائے پلائے، پہنے پہنائے، اپنی اور دوسروں کی ضروریات پر خرچ کرے مگر جمع کر کے نہ رکھے۔[50] خرچ کا فائدہ منفعت للناس ہے اور یہی تصریفِ زر (CIRCULATION OF WEALTH) کی تھیوری ہے۔" زبہر نہادن چہ سنگ وچہ زر[51] جمع کرنے کے لیے پتھر اور سونا برابر ہیں کیونکہ منفعت للناس کا نہ ہونا دونوں میں مشترک ہو گیا۔ ترک کا مقصد "حضورِ قلب" کا حصول ہے۔[52]

ایک موقع پر حضرت محبوب الٰہیؒ نے فرمایا کہ دنیا تین طرح کی ہوتی ہے۔ ایک صورۃً بھی دنیا ہے معناً بھی (جیسے ضرورت سے زیادہ دولت) دوسری صورۃً و معناً دنیا نہیں ہے (مثلاً با اخلاص عبادت) اور تیسری صورۃً دنیا ہے معناً نہیں ہے (جیسے ادائے حقِ زوج)۔[53]

لہٰذا مشائخِ چشت کے نزدیک "ترکِ دنیا" کا مفہوم یہ ہے کہ مالِ دنیا سے نفرت نہ ہو، نہ دنیا کمانے میں اتنا اندھا ہو جائے کہ حلال و حرام کی تمیز اٹھ جائے۔ حضرت چراغ دہلیؒ نے فرمایا کہ علاقۂ دنیا بقدرِ عرفان کم ہوتا ہے۔[54]

حبِ مال سے آگے اور زیادہ دشوار منزل حبِ جاہ کی ہے۔[55] حدیث میں آیا ہے:

آخِرُ مَا یَخْرُجُ عَنْ رُؤُوسِ الصِّدِّیقِینَ حُبُّ الْجَاہِ	سب سے آخر میں صدیقوں کے دماغ سے حُبِ جاہ کی بو نکلتی ہے۔

چشتی صوفیاء کی خانقاہ میں لوگ کس طرح مساوات سے رہتے تھے اِس کا اندازہ صرف اِس بات سے ہو سکتا ہے کہ ایک بار حضرت نظام الدینؒ پلنگ پر تشریف رکھتے تھے اور سب حاضرین فرش پر تھے۔ آپ نے معذرت پیش کی کہ

میری ٹانگ میں درد ہے اس لیے فرش پر نہیں بیٹھ سکتا ہوں۔[۵۶]

محبوب الٰہیؒ نے فرمایا کہ دنیا دار تین طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک تو وہ جو دُنیا کو دوست رکھتے ہیں اور ہمہ وقت اُس کا ذکر کرتے ہیں۔ ایسے لوگ اکثریت میں ہیں۔ دوسرے وہ جو اُسے دشمن سمجھتے ہیں اور دنیا کی مذمّت کرتے رہتے ہیں۔ یہ نسبتہً کم ہیں۔ تیسرا گروہ وہ ہے جو نہ دنیا کو دوست رکھتا ہے نہ دشمن۔" این قسم به از ہر دو قسم۔"[۵۷]

یہ ایک طرح کی مثبت بے تعلّقی ہے۔ منفی رجحان یا فرار نہیں ہے۔[۵۸] نہ یہ لنگوٹہ باندھنے یا برہنہ رہنے کا نام ہے۔ ایک شخص کیتھل میں تارکِ دنیا تھا اور ننگا رہتا تھا۔ حضرت محبوب الٰہیؒ کے سامنے اُس کا تذکرہ ہوا تو آپ نے فرمایا:

اگر او را پیرے .بودے	اگر کوئی اُس کا پیر ہوتا تو اُسے بدن
سترِ عورت .بفرمودے[۵۹]	ڈھانپنے کا حکم دیتا۔

جب ترکِ دنیا کا یہ مقصود حاصل ہو جائے تو اگلی منزل "ترکِ عقبیٰ" کی ہے یعنی عبادت و ریاضت یا حسنِ معاملات سے اجر و ثواب کا تصوّر اُٹھ جائے۔ بقولِ غالبؔ:

طاعت میں تا رہے نہ مئے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

خدا کی عبادت اِس لیے کرنی چاہیے کہ وہ خالق ہے ہم مخلوق ہیں۔ وہ اِلٰہ ہے، ہم عبد ہیں۔ حور و قصور کے لالچ یا مئے و انگبیں کی لاگ میں نہیں۔[۶۰] "ثواب" کا عقیدہ نیک کام کے درمیان سے اُٹھ جائے تو اُس کی جگہ "احساسِ فرض"

آجائے گا یعنی ایک تصوّر تو یہ ہے کہ بھوکے کو کھانا کھلانے سے ثواب ہوتا ہے اور دوسرا یہ ہے کہ ثواب ہو یا نہ ہو یہ ایک اچھا کام ہے اور صاحبِ استطاعت پر فرض ہے۔ ظاہر ہے کہ دوسرے جذبے کی اخلاقی قیمت زیادہ ہے۔ ثواب کے تصوّر میں صرف انفرادی نجات ہے اور احساسِ فرض کے پیچھے پورے معاشرے کی فلاح کا عقیدہ ہے۔

ترکِ عقبیٰ کے مقام سے گزر کر "ترکِ مولیٰ" کا مرتبہ ہے۔ یہ فنا کی منزل ہے اور یہاں سے وحدت الوجود کی تعبیریں شروع ہو جائیں گی اور اِس سے اگلی منزل "ترکِ ترک" کامل توحید ہے جو اضافات کے سقوط کا نام ہے۔ گویا ترک کی اضافت بھی ساقط ہو گئی۔

"ترکِ ترک" کے سوا ایک منزل "ترکِ اختیار" کی بھی ہے یعنی "باختیارِ خود کارے نمی باید کرد"[61] یہ منزلِ رضا عبادت کی انتہائی غایت ہے۔ حضرت چراغ دہلیؒ نے آیۃ قرآن اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَھُمْ وَ اَمْوَالَھُمْ بِاَنَّ لَھُمُ الْجَنَّۃَ .... کی تفسیر میں ایک عجیب نکتہ بیان کیا کہ خدا نے نفس کو جنّت کے بدلے خرید لیا ہے۔ بیچنے والے کے لیے اُس شے کی "ملکیّت" ضروری ہے جسے وہ فروخت کر رہا ہے۔ اِس لیے نفس کو مجاہدہ کے ذریعے "قابو" میں لانا ضروری ہے۔ یہی نفس کشی کا فلسفہ ہے[62]

(۳) روحِ عبادات:

عبادات میں صوفیائے چشت نے فرض عبادتوں کے علاوہ کچھ نوافل اور مسنون دعائیں یا اذکار بھی راہِ سلوک کے سالکوں کو تعلیم کیے ہیں، مگر عبادات

بقدرِ استطاعت تجویز کی جاتی تھیں مثلاً کسی کو صومِ دوام، کسی کو صومِ داؤدی، کسی کو صرف صومِ رمضان۔ حضرت محبوب الٰہیؒ کی خانقاہ میں ایسے بھی تھے جو کسی معذوری کی وجہ سے صرف رمضان کے روزے رکھتے تھے۔ اِسی طرح نفل عبادتوں کو ہر سالک نے اپنی مقدرت کے مطابق اختیار کر رکھا تھا۔ دراصل مشائخِ چشت نے طاعات تین طرح کی بتائی ہیں: طاعتِ مالی، طاعتِ بدنی اور طاعتِ خُلقی[۶۳]۔ یہ سب قفلِ سعادت کی کنجیاں ہیں اور اِن میں سے کسی کلید سے بھی کُشادِ کار ممکن ہے مگر ان میں طاعتِ خُلقی کا درجہ افضل ہے۔

نماز کی روح حضورِ قلب[۶۴] ہے۔ لَاصَلٰوۃَ اِلّا بِحُضُوْرِ الْقَلْب۔ علماء اور فقراء کی نماز میں فرق ہے۔ علماء یا کعبہ کو دیکھ کر نماز پڑھیں گے یا اُس کی سمت میں نیّت باندھیں گے یا جہت معلوم نہ ہو تو تحرّی یعنی اندازے سے اُدھر کا رُخ کریں گے مگر "فقراء تا عرش نہ بینند نماز نکنند"[۶۵]۔ اِس سے وہی "حضورِ قلب" مراد ہے[۶۶]۔ یہ صوفیاء کے نزدیک صلاحِ دل کی علامت ہے کیونکہ دل معصیّت سے پاک ہو تو ذوقِ طاعت پیدا ہوتا ہے۔

زکوٰۃ درویشوں پر واجب ہی کہاں ہوتی ہے مگر اُن کا سارا مال "سبیل" ہے اِسی لیے حضرت بابا فرید گنج شکر علیہ الرحمۃ نے فرمایا کہ زکوٰۃ تین طرح کی ہوتی ہے[۶۷]۔

زکوٰۃِ شریعت یہ ہے کہ چالیس روپے میں سے ایک روپیہ راہِ خدا میں دے دیا جائے۔

زکوٰۃِ طریقت یہ ہے کہ ایک روپیہ خود رکھ کر باقی راہِ خدا میں دیدے اور

زکوٰۃِ حقیقت یہ ہے کہ سب راہِ خدا میں دیدے خود کچھ نہ رکھے۔

اور چشتی صوفیاے کرام نے عملی زندگی میں اِسی "زکوۃ حقیقت" کے ادا کرنے کا ثبوت دیا ہے۔ جب زکوۃ شریعت ہی واجب نہ ہو تو حج کہاں سے فرض ہوگا؟ اس لیے اِن بزرگوں نے درویشوں کے سفرِ حج پر جانے کی زیادہ حوصلہ افزائی نہیں کی۔ راستے دشوار تھے۔ مہینوں کا سفر تھا۔ فقر کی وجہ سے زادِ راہ کافی ہوتا نہیں تھا۔ راستے میں تو بت سوال کرنے کی بھی آسکتی تھی۔ حج جب فرض نہیں ہے تو اُس کے لیے نفس کو تکلیف دینا کیا ضرور ہے۔[۶۸] جو عبادتیں فرض ہیں اور جن کے لیے وہ مکلّف ہے اُنھیں کو خیر و خوبی سے کیوں نہ ادا کیا جائے۔ ایک درویش بے سروسامانی کے عالم میں حج کے لیے نکلے۔ راستے میں بھوک سے عاجز ہوکر ایک مسجد میں نماز کے بعد اُنھوں نے سوال کیا کہ ہم "اللہ کے مہمان ہیں"۔ دوسرے بزرگ نے کہا کہ جب تمھارے پاس زادِ راہ نہیں تھا تو حج کرنے کیوں نکلے تھے؟ اِنھوں نے کہا کہ ہمارا زادِ راہ تقویٰ ہے۔ قرآن میں ہے: وَتَزَوَّدُوا فَإِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى۔ یہ بزرگ برہم ہوگئے اور کہنے لگے کہ تم احمق ہو۔ قرآن کا مطلب بھی نہیں سمجھتے۔ وہ کہتا ہے کہ توشہ لے کر چلو کیونکہ بہترین زادِ راہ کا ساتھ ہونا ہی تقوے کی ضمانت ہے۔ اگر تمھارے پاس زادِ راہ ہوتا تو سوال کی ذلّت سے محفوظ رہتے۔

(۴) خدمتِ خلق:

اب یہ دیکھنا ہے کہ اِن صوفیا کے نزدیک مذہب کی روح اور غایتِ اقصیٰ کیا تھی؟ علماے ظاہر کے برخلاف اِنھوں نے اُسے دنیا طلبی، جاہ پسندی اور عزّت و شہرت کے حصول کا وسیلہ نہیں بنایا بلکہ اسلام کی روح کو خدمتِ خلق،

رواداری اور صلح جوئی میں تلاش کیا۔

آج دنیا بھر میں عیسائی مشنریاں صرف ایک نعرۂ خدمت (SERVICE OF HUMANITY) کو لے کر دوسرے مذاہب کو شرمندہ کر رہی ہیں۔ اُن کے پاس بڑے مالی وسائل ہیں۔ جنگ کے میدان میں زخمیوں کی خدمت، ہسپتال قائم کر کے مریضوں کا علاج، قحط زدہ علاقوں میں خوراک سے بھوکوں کی امداد، تعلیمی اداروں وغیرہ کا قیام۔ اُن کی سرگرمیاں مختلف نوعیّت کی ہیں۔ اِس کے ساتھ ہی وہ بائبل کے مواعظ بھی سناتی ہیں، عیسائیت کا لٹریچر مفت تقسیم کرتی ہیں، تبدیلِ مذہب کا لالچ دیتی ہیں اور اُن کا مذہب قبول کرنے والوں کو بہت سی عنایتیں بھی حاصل ہو جاتی ہیں۔ پسماندہ اور جاہل اور استحصال کے شکار علاقوں میں اُنھیں خاصی کامیابی ہوئی ہے۔

یہ چشتی صوفیا بھی دراصل اسلام کے مبلّغ (MISSIONARIES) تھے مگر کیا اُن کے پاس اتنے عظیم فنڈ تھے؟ کیا اُن کی تحریک اِتنی منظّم تھی؟ کیا وہ پروپیگنڈے کے فن سے کام لیتے تھے۔ کیا وہ مظلوموں اور بیکسوں کی امداد کسی ذاتی یا سیاسی غرض سے کرتے تھے؟ بے سروسامانی اور فقرِ محض کے باوجود اُن کی خانقاہوں میں دن رات لنگر جاری تھا۔ فتوح[69] میں نقد آیا تقسیم ہو گیا، نذرانے میں اشرفیاں آئیں لُٹ گئیں، ہدیہ میں کپڑا آیا بانٹ دیا گیا۔"

مشائخِ چشت نے خانقاہ چلانے کے لیے تین چیزوں کی ضرورت بتائی ہے: حال، قال (علم) اور مال ــــ مگر حضرت چراغ دہلیؒ نے فرمایا کہ مال کی بھی ضرورت نہیں، حال اور علم کافی ہیں[71]۔ "حال" یہ ہے کہ انسانیت کے درد کو اپنا

"حال" بنالیں۔ چنانچہ ایک بار حضرت محبوب الٰہیؒ نے فرمایا[۷۲]:

"آن قدر غم و اندوہ کہ مراست، ہیچ کس را درین جہان نیست۔ زیرا کہ چندین خلق می آیند و غم و اندوہِ خویش می گویند ہمہ۔ بر دل و جان من می نشیند۔ عجب دلے باشد کہ غمِ برادرِ مسلمان بشنود و دروے اثر نکند۔"

جتنا غم و اندوہ مجھے ہے اُتنا اِس دنیا میں کسی کو نہ ہوگا کیونکہ اِتنے لوگ آتے ہیں اور اپنا دُکھ درد کہتے ہیں وہ سب میرے دل و جان میں بیٹھ جاتا ہے۔ عجب دل ہوگا جو اپنے مسلمان بھائی کا غم سُنے اور اُس پر اثر نہ ہو۔

حضرت محبوب الٰہیؒ اکثر روزہ رکھتے تھے اور سحر کے وقت بھی بہت ہی قلیل غذا تناول فرماتے تھے۔ آپ کے خادم خواجہ عبدالرحیم جن کے ذمّے سحری کا لے جانا تھا، بیان کرتے ہیں کہ اکثر ایسا ہوتا کہ حضرت خواجہؒ سحری کے وقت کچھ بھی نہ کھاتے، میں نے عرض کیا کہ آپ افطار میں بھی نہیں کھاتے، اگر سحری بھی نہ کھائیں گے تو ضعف بڑھ جائے گا۔ آپ پر گریہ طاری ہوگیا اور فرمایا: "کتنے غریب اور بیکس مسجدوں کے کونوں اور چبوتروں پر بھوکے پڑے ہوئے ہیں اور فاقے سے رات گزار دیتے ہیں۔ یہ کھانا بھلا میرے حلق سے نیچے کس طرح اُتر سکتا ہے[۷۳]۔"

حضرت محبوب الٰہیؒ نے ایک عورت کو دیکھا کہ دریائے جمنا کے کنارے ایک کنوئیں سے پانی بھر کر لے جارہی ہے۔ آپ نے اُس سے کہا کہ تو دریا کو چھوڑ کر کنوئیں کا پانی کیوں پیتی ہے؟ اُس نے کہا کہ میرا شوہر غریب ہے، ہمارا گھر کا خرچ مشکل سے چلتا ہے۔ جمنا کا پانی بھوک زیادہ لگاتا ہے اِس لیے ہم کنوئیں کا پانی پیتے ہیں۔ حضرت یہ سُن کر رونے لگے اور خانقاہ میں آکر اپنے خادم سے کہا کہ غیاث پور

میں ایک عورت ہے جو جمنا کا پانی نہیں پیتی کیوں کہ اُس سے بھوک زیادہ لگتی ہے۔ تم جاکر اُس سے پوچھو کہ اُس کے ماہانہ خرچ میں کتنا خسارہ رہتا ہے، اتنا خرچ ہر مہینے اُسے ہماری خانقاہ سے دیا کرو۔ اور اُس سے کہو کہ جمنا کا پانی پیے۔"[۴]

ایک بار غیاث پور میں آگ لگ گئی۔ گرمی کا موسم تھا۔ آپ چلچلاتی دھوپ میں اپنے مکان کی چھت پر کھڑے ہوئے آگ لگنے کا منظر اُس وقت تک دیکھتے رہے جب تک وہ بجھ نہ گئی۔ پھر خواجہ اقبال کو بُلایا اور فرمایا کہ جاکر گھروں کی گنتی کرو کہ کتنے آگ سے متاثر ہوئے ہیں۔ اور ہر گھر والے کو چاندی کے دو تنکے، دو روٹیاں اور ایک صراحی ٹھنڈے پانی کی پہنچاؤ۔ بستی کے لوگ اُس وقت بہت ہی پریشان اور مضطر تھے۔ جب خواجہ اقبال کھانے کا خوان اور پانی کی صراحی اور چاندی کے تنکے لے کر ہر ایک کے گھر پہنچے تو لوگ خوشی سے آب دیدہ ہو گئے۔ دو تنکے اُس زمانے میں اتنی قیمت رکھتے تھے کہ اس سے کئی چھپّر ڈلوائے جاسکتے تھے۔"[۵]

یہ ہزاروں واقعات میں سے چند کی طرف مختصر اشارے ہیں اور اِن سے یہ وضاحت کرنا مقصود ہے کہ خدمتِ خلق بھی اِن صوفیاے کرام کا "حال" تھا اور دنیا کی کوئی جماعت یا ادارہ یا مشنری یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ انھوں نے اِن مشائخ سے زیادہ دل سوزی سے مجروح انسانیت کی خدمت کی ہوگی، اور اُسے اپنا حال بنا لیا ہوگا۔ پھر آج اِن مشائخ کے نام لیوا اُن کے اِس مشن کی اہمیّت کا احساس کیوں نہیں کرتے۔

(ج) خانقاہی تربیت کا ماحصل:

اب یہ دیکھنا ہے کہ چشتی مشائخ کی خانقاہوں میں کس طرح کے انسان ڈھالے جاتے تھے اور اِن بزرگوں کی تربیت کا ماحصل کیا تھا۔

اِس کا پہلا اصول "تخلیہ" یعنی قلب کو گناہوں کی رغبت اور میلان سے خالی کرنا اور دوسرا مرحلہ "تحلیہ" یعنی سیرت کو اچھے اخلاق کے زیور سے آراستہ کرنا ہے۔[۷۶] مشائخ نے فرمایا کہ ذمائم کے سرچشمے چار ہیں: دنیا، خلق، شیطان اور نفس۔ پھر یہ تجویز کیا کہ دنیا کا علاج تجرّد ہے (یعنی اسبابِ دنیا سے بے تعلّقی) اور خلق سے بچاؤ تفرّد (گوشہ گیری) میں ہے۔ شیطان کا علاج مُحارَبت (جنگ) اور نفس کا تقویٰ ہے۔ ان چار محاذوں پر سالک کامیاب رہے تو اُس کا ہر قدم کمال کی طرف بڑھتا جائے گا۔[۷۷] یہاں تک کہ وہ "صحرائے قُرب" میں داخل ہوجائے اور راہ میں جو مقامات و احوال پیش آئیں گے وہ اُس کے "حاکم وقت" ہوجائیں گے۔[۷۸]

۱- توبہ و استقامت:

سلوک کی ابتداء توبہ سے ہوتی ہے۔ توبہ کا عملی مظاہرہ یہ ہے کہ اگر پہلے کسی کو بُرا کہا ہو تو جا کر اُسے خوشنود کرے اور اُس سے معافی طلب کرے اور وہ شخص مرچکا ہے تو اُس کی روح کو ایصالِ ثواب کے لیے غلام آزاد کرے کیونکہ غلام کو آزاد کرنا مُردہ کو زندہ کرنے کی برابر ہے۔[۷۹]

قبولِ توبہ کی نشانی یہ ہے کہ جن افعال سے توبہ کی ہے اُن سے دل میں

نفرت پیدا ہوجائے اور اُن گناہوں کی یاد سے نفس کو لذّت حاصل نہ ہو۔ جوانی کی توبہ سب سے اچھّی ہے۔ بڑھاپے میں توبہ نہ کرے گا تو کیا کرے گا؟[80] بعض مشائخ نے یہ بھی کہا ہے کہ متقیٔ محض سے گناہگارِ تائب کا مرتبہ افضل ہے۔[81]

توبہ کی روح استقامت ہے جو سلوک کا مقصود ہے۔[82] ایک دن عالمِ استغراق میں حضرت محبوب الٰہیؒ سے باباصاحبؒ نے فرمایا تھا، کیا چاہتے ہو؟ عرض کیا استقامت۔ فرمایا: دادیم۔ چونکہ لسانِ حال میں اثر ہوتا ہے، حضرت محبوب الٰہیؒ فرماتے تھے کہ شیخ کے ارشاد کا اثر اُسی وقت طبیعت میں محسوس ہوا۔[83]

استقامت کیا ہے اِسے ایک واقعہ سے سمجھ لیجیے۔ حضرت حمید سوالی (متوفی ۶۷۳ھ) حضور غریب نوازؒ کے خلیفہ تھے اور اُنھیں قطب صاحبؒ سے بھی خرقہ ملا تھا۔ بیعت سے پہلے "افتد و دانی" کا مزہ چکھ چکے تھے۔ پرانے دوست پھر آئے اور اُنھوں نے عیش کوشی کی طرف مائل کرنا چاہا۔ اِنھوں نے فرمایا:

"بروید و گوشہ بنشینید کہ ایں ازار بند خود را من چناں محکم بستہ ام کہ فردائے قیامت بحُورانِ بہشت ہم نکشایم۔"[84]

جاؤ اور گوشہ میں بیٹھو، میں نے تو اپنا ازار بند ایسا مضبوط باندھا ہے کہ کل قیامت کے دن حورانِ بہشت پر بھی نہ کھولوں گا۔

۲۔ صدق و اخلاص:

درویش کا ظاہر و باطن یکساں ہونا چاہیے۔[85] خلوت میں بھی وہی کرے

جو جلوت میں کرتا ہو۔ بعض لوگوں کا ظاہر آراستہ ہوتا ہے باطن خراب، بعض کا باطن آراستہ ہے ظاہر خراب۔ ایک طبقہ وہ ہے جس کا ظاہر و باطن دونوں خراب ہیں۔ چوتھا اور سب سے افضل گروہ اُن لوگوں کا ہے جن کے ظاہر و باطن دونوں آراستہ ہیں[۸۶]۔ یہ کیفیت صدق و اخلاص سے حاصل ہوتی ہے۔ صدق زیادہ ہو تو کم طاعت بھی نافع ہے[۸۷]۔ صدق یہ ہے کہ عُجب و ریا نہ ہو، اپنے حال کو چھپائے رکھے[۸۸]۔ اعمال کا تعلق نیّت سے ہے اور خدا نیّت کو خوب جانتا ہے۔ مخلوق سے زہد و عبادت کا کچھ صلہ لینا نہیں ہے تو پھر نیّت درست کیوں نہ رکھی جائے۔

ساتھ ہی محاسبۂ نفس ہوتا رہے۔ اپنے نفس پر ایک گھڑی عتاب کرنا ستّر سال کی عبادت سے اچھا ہے[۸۹]۔ اگر آپس میں جھگڑا بھی ہو تو رفق و ملاطفت کو ہاتھ سے نہ جانے دے[۹۰]۔ کسی ساتھی کو نصیحت کرنا ہو تو اُسے تنہائی میں خوش اسلوبی سے سمجھا دے۔ سب کے سامنے فضیحت نہ کرے[۹۱]۔

۳۔ اِطعام :

لقمۂ حلال کا اہتمام کرے[۹۲]۔ اگر میسّر نہ ہو تو فاقہ کو فقیر کی شبِ معراج سمجھے[۹۳]۔ سلسلۂ چشتیہ میں اِطعام (کھانا کھلانا) کی فضیلت سب سے زیادہ ہے۔ مشائخ نے ہر آنے جانے والے کے لیے لنگر عام رکھا ہے[۹۴]۔ حضرت محبوب الٰہیؒ نے فرمایا کہ درویشی کی شان ہی اِطعام ہے[۹۵]۔ ایک اور موقع پر فرمایا کہ یہ ہمارے خانوادے کی خصوصیات میں سے ہے۔ حضرت بابا فرید گنج شکر علیہ الرحمۃ کی خدمت میں کوئی شخص اپنی مصیبت بیان کرکے دعا

کرانے یا تعویذ لینے آتا تھا تو آپ اصرار کرتے تھے کہ پہلے کچھ کھا لو۔ حضرت محبوب الٰہیؒ کا بھی اِس پر عمل رہا۔ آپ نے متعدد بار اپنی مجلسوں میں یہ حدیث بیان فرمائی کہ:

مَن زار حیّاً ولم یذُق مِنْہُ شیئاً فکانما زار میّتاً	جس نے کسی زندہ شخص سے ملاقات کی اور اُس کے ہاں کچھ نہ چکھا تو گویا اُس نے ایک مُردے کی زیارت کی۔[96]

حضرت محبوب الٰہیؒ کی خانقاہ میں لوگ گروہ در گروہ آتے تھے اور اُن کے لیے بار بار کھانا لایا جاتا تھا۔[97]

۴۔ توکّل

اِس عام لنگر کا دار و مدار توکّل پر تھا۔ توکّل کی تشریح بھی اہلِ تصوّف کے معاندوں نے غلط کی ہے۔ ترکِ دنیا کی طرح یہ بھی منفی رویّہ نہیں مثبت کمال ہے۔ توکّل کے تین مدارج ہیں۔ ایک وہ جو موکّل اپنے وکیل پر کرتا ہے۔ دوسرا وہ جو شیر خوار بچّے کو اپنی ماں پر ہوتا ہے اور تیسرا وہ حال ہے جو مُردے کا غسّال کے ہاتھوں میں ہوتا ہے۔[98]

رزق بھی چار قسم کا ہوتا ہے: رزقِ مضمون، رزقِ مقسوم، رزقِ مملوک اور رزقِ موعود — مشائخ کو یہی رزقِ موعود ملتا ہے اور اِس کی سند قرآن کی یہ آیت ہے:

ومن یتّقِ اللہ یجعل لہٗ مخرجاً ویرزقہٗ مِن حیثُ لا یحتسِب انّ اللہ بالغُ أمرِہٖ۔ قد جعل اللہ	اور جو اللہ سے ڈرتا ہے خدا اُس کے لیے راہیں کھول دیتا ہے اور اُسے وہاں سے رزق دیتا ہے جہاں اُس کا گمان

لِکُلِّ شَیْئٍ قَدْرًا۔ | بھی نہیں جا سکتا۔ اللہ اپنے حکم کو پورا کرنے والا ہے اور اُس نے ہر شے کی قیمت مقرّر کردی ہے۔

اِن چاروں قسموں میں توکّل کا تعلّق صرف رزقِ مضمون سے ہے۔[99]

بظاہر خانقاہ کے مصارف فتوح سے پورے ہوتے تھے۔ یہ وہ نذرانہ ہے جو ارادت مند حضرات مشائخ کی خدمت میں بے طلب پیش کرتے تھے۔ حضرت محبوب الٰہیؒ نے فتوح کا اصول لاحدّ ولاردّ ولاکدّ بتایا ہے۔[100] یعنی مرید پر اپنی طرف سے نذرانہ مقرّر نہ کرے اور اگر وہ خوشی سے دے، تو ردّ نہ کرے اور اگر نہ دے تو اُس سے کدّ نہ رکھے۔ امیروں اور بادشاہوں کے نذرانوں اور جاگیروں کو مشائخ چشت نے قبول نہیں فرمایا۔[101] باباصاحبؒ نے بلبن کی نذر کردہ جاگیر کے قبالے واپس کردیے تھے۔ حضرت نظام الدین اولیاؒ کی خدمت میں بھی بار بار جاگیر پیش کی گئی۔ آپ نے مسکرا کر فرمایا: "اگر میں اِسے قبول کرلوں تو لوگ یوں کہا کریں گے کہ آج شیخ اپنا باغ دیکھنے گئے ہیں۔ آج کھیتوں کی نگرانی کرنے گئے ہیں۔ مجھے اِن باتوں سے کیا سروکار۔" پھر آنکھیں ڈبڈبا گئیں اور فرمایا کہ "ہمارے تو مشائخ نے بھی کبھی جاگیریں قبول نہیں کیں۔[102]"

فرمایا: مشائخ کا طریق یہ ہونا چاہیے کہ نہ کسی سے سوال کرے اور نہ دل میں خیال کرے کہ یہ چیز مجھے مل جاتی تو اچھا ہوتا۔[103]

۵۔ انفاق:

یہ حضرات بے اسباب خوش رہنا جانتے تھے اور اپنے متوسّلین کو خوش

ہو کر اسی کی دعا دیتے تھے[104]۔ جب توکّل کامل اور راسخ ہو گا تو مال خرچ کرنے میں راحت نصیب ہو گی اور یہ خوف دل میں نہیں آئے گا کہ کل کیا ہو گا؟ محبوبِ الٰہیؒ نے ایک دلچسپ نکتہ بیان فرمایا کہ دنیا کی جو راحتیں ہیں وہ پیسہ خرچ کر کے ہی حاصل ہوتی ہیں لہٰذا ثابت ہو گیا کہ خرچ کرنے میں راحت ہے[105]۔

اسلام شاید دنیا کے مذاہب میں اس لحاظ سے تنہا ہے کہ اُس نے اِنفاقِ اموال کو بہترین عبادت قرار دیا ہے اور اِس کی سخت تاکید کی ہے:

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوا مِمَّا تُحِبُّوْنَ	تم نیکی حاصل کر ہی نہیں سکتے جب تک اپنی پسندیدہ چیزوں میں سے خرچ نہ کرو۔

اور

يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوا أَنْفِقُوا مِمَّا رَزَقْنَاكُمْ مِنْ قَبْلِ أَنْ يَأْتِيَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ فَيَقُولَ رَبِّ لَوْلَا أَخَّرْتَنِي إِلَى أَجَلٍ قَرِيْبٍ فَأَصَّدَّقَ وَأَكُنْ مِنَ الصَّالِحِيْنَ	اے ایمان لانے والو ہم نے تمھیں جو کچھ رزق دیا ہے اُسے اِس سے پہلے خرچ کر ڈالو کہ تم میں سے کسی کو موت آجائے اور اُس وقت وہ کہے کہ اے رب اگر تو اِس موت کو ذرا دیر کے لیے ٹال دیتا تو میں سچّا بن جاتا اور نیکوں میں شامل ہو جاتا۔

اگر مال جمع بھی کیا جائے تو اُس کا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ " از وے بدیگرے منفعتے برسد[106]"

ایک اور دلچسپ نکتہ حضرت محبوب الٰہیؒ نے بیان فرمایا کہ اگر کسی شخص کا ستارۂ اقبال اوج پر ہے اور دولت آ رہی ہے تو خوب خرچ کرے کبھی نہیں گھٹے گی اور اگر ستارہ زوال پر ہے اور دولت جا رہی ہے تب بھی خوب خرچ کرے کیونکہ اُسے بہر حال جانا ہی ہے بجائے اِس کے کہ دوسروں کے ہاتھوں میں ہماری ناخوشی سے جائے، اپنے ہی ہاتھوں کیوں نہ خوشی خوشی خرچ کر دی جائے۔[107]

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر اتنا انفاق کیا جائے تو اسراف سے بچنے کی کیا سبیل ہوگی اور اس کی تمیز کیسے ہوگی کہ یہ اسراف نہیں ہے؟ محبوب الٰہیؒ نے یہ اشکال بھی ایک چٹکلے میں رفع کر دیا۔ فرمایا کہ جو کچھ بغیر نیّتِ خیر خرچ کیا جائے اور خدا کی خوشنودی کے لیے نہ ہو وہ اسراف ہے خواہ ایک دھیلا ہی ہو اور نیکی کی نیّت سے خدا کے راستے میں دونوں جہان بھی لُٹا دے تو اسراف نہیں ہے۔[108]

مالِ دنیا کے ساتھ درویش کا معاملہ یہ ہونا چاہیے کہ "اگر برسد مرحبا واگر نرسد ہم مرحبا۔ در ہر دو حال خوش باشد۔[109]" یعنی

آتا ہو تو ہاتھ سے نہ دیجے
جاتا ہو تو اُس کا غم نہ کیجے

یہ اِن مشائخ کی مبارک زندگی تھی کہ تمام عمر کوئی جاگیر قبول نہیں کی، خزانہ جمع نہیں کیا۔ کوئی مستقل ذریعۂ آمدنی پیدا نہیں کیا۔ سرکار دربار کو منہ نہیں لگایا۔ جو کچھ عوام کے نذرانوں اور فتوحات کی صورت میں آیا اُسے فوراً فقرا، اور مساکین پر خرچ کر دیا اور جیسے خالی ہاتھ اپنے خالق کے پاس سے آئے تھے ویسے ہی اُس

کے حضور میں پہنچ گئے۔ اِسی کا نام "ترک و تجرید" ہے اور اِس کی مثال یہ ہے کہ جب حضرت بابا فرید گنج شکرؒ کا انتقال ہوا تو آپ کے گھر میں تجہیز و تکفین کا سامان بھی موجود نہیں تھا۔ لحد کے لیے کچی اینٹوں کی ضرورت ہوئی تو حجرے کی ایک دیوار ڈھا کر اُس کی اینٹیں لحد مبارک میں لگائی گئیں۔[۱۱۰]

یہاں تک چشتی تعلیمات کا خلاصہ اِس نظر سے پیش کیا گیا ہے کہ اِن میں نہ کوئی بات اسلامی شرع کے خلاف ہے[۱۱۱] نہ عالمی اخلاقی اقدار سے معارض ہے، نہ اِسے منفی اور فراری رویّہ کہا جا سکتا ہے بلکہ امام غزالی کے لفظوں میں دنیا بھر کے فلاسفہ اور حکما، مل کر بھی چاہیں تو اِن میں سے کسی ایک شق کے لیے بہتر متبادل فراہم نہیں کر سکتے۔

(د) عہدِ حاضر میں چشتی تعلیمات کی معنویت :

جس زمانے میں چشتی مشائخ نے اپنا نظامِ تربیت جاری کیا تھا، ہندستان کا نقشہ بالکل مختلف تھا۔ اُس کی چند خصوصیات یہ تھیں، جن کا اب تصوّر بھی نہیں کیا جا سکتا۔

(۱) مسلمان حکمراں ضرور تھے مگر نہایت قلیل تعداد میں تھے۔ غالب اکثریت ہندستان کے اصلی باشندوں کی تھی جن کے اپنے عقائد، رسوم، شعائر اور عبادات تھیں جو اسلام جیسے سامی تہذیب کے مذہب سے کلّی مغائرت رکھتی تھیں۔ حضرت محبوب الٰہیؒ کا ایک مرید اپنے ہندو دوست کے ساتھ خانقاہ میں آیا اور اس کا تعارف یہ کہہ کر کرایا کہ "این برادر من است"۔ حضرتؒ نے فرمایا کہ "اِس قوم پر کسی

کے کہنے سننے سے اثر نہیں ہوتا۔ ہاں کسی صالح کی صحبت میسر آجاتی ہے تو اُس کی برکت سے اسلام قبول کر لیتے ہیں[۱۱۲]۔" اور یہ صوفیا ہی تھے جن کے اعمال صالحہ کو دیکھ کر اسلام قبول کرنے کی ترغیب فقراء و مساکین میں پیدا ہوتی تھی۔ علماء نے تو زیادہ تر قتل اور کفر کے فتوے ہی دیے ہیں یعنی مسلمانوں کو کافر بنایا ہے، کافروں کا مسلمان کرنا اُن کے نصیب میں نہیں آیا۔

(۲) یہاں ایک مطلق العنان بادشاہ ہوتا تھا۔ اُس کے خاندان کے افراد اور دوسرے اعلیٰ حکام مل کر ایک طبقۂ اشراف بناتے تھے جس کے ہاتھ میں ساری دولت اور سارے وسائل تھے۔ گویا زندگی کی ہر نعمت، ہر مسرت ہر عیش اور راحت "تجمّل حسین خاں" کے لیے تھی۔ دوسروں کو بس " نظر گذر" کا حصّہ ملا تھا۔

(۳) دوسرا طبقہ علماء کا تھا۔ یہ مذہب کے محافظ کہلاتے تھے مگر دراصل مذہب کے نام پر حکومت کی حفاظت کرتے تھے اور عوام کے ذہنوں میں جاگیرداری اور مطلق العنانی کا رعب داب قائم رکھتے تھے۔

(۴) طبقۂ امراء میں ضرورت سے زاید بلکہ دوسروں کے نصیب کی دولت بھی سمٹ آئی تھی۔ اِس لیے طرح طرح کی اخلاقی کمزوریاں، فضول رسمیں، لذّت کوشی، اسراف اور خواہشاتِ نفسانی کا اتّباع اپنی حد سے گزر گیا تھا۔ عہدِ سلطنت کا حال (التتمش اور ناصر الدین جیسے مستثنیٰ بادشاہوں کو چھوڑ کر) تاریخ میں دیکھ لیجیے۔ مثل ہے کہ: النّاسُ علیٰ دینِ ملوکھم۔ بادشاہوں کے رجحان سے عوام کا کردار بھی بنتا تھا۔ حضرت محبوب الٰہیؒ نے ابتدائی زمانے میں دہلی کی اخلاقی پستی

کا حال دیکھ کر اس شہر سے نکل جانے کا ارادہ کر لیا تھا مگر ایک درویش نے اُنھیں سمجھایا اور کہا:[۱۱۳]

آن روز کہ مہ شدی نمی دانستی
کانگشت نمائے عالمے خواہی شد!

اُنھوں نے دہلی میں رہ کر ہی اخلاقیات کی اصلاح کا مشن شروع کر دیا اور پھر اپنے خلیفہ حضرت چراغ دہلیؒ کو بھی تاکید فرمائی کہ "جفا و قفائے مردمان باید کشید[۱۱۴]"۔ اگر یہ بزرگ اپنی ہی نجات کے طالب ہوتے تو صحرا نشینی میں کون مانع ہو سکتا تھا؟ مگر چشتی نظام کا مقصد تو وہی SERVICE OF HUMANITY تھا جسے آج حریف اپنا حصہ بتا رہے ہیں! یہ صوفیا صحیح معنوں میں اسلام کے مشنری تھے۔ حضرت محبوب الٰہیؒ نے اُسی درویش کا قول نقل کیا ہے: "این چہ قوّت باشد و چہ حوصلہ کہ از خلق گوشہ گیرند و بحق مشغول شوند۔ یعنی قوت و حوصلہ آن باشد کہ باوجود خلق بحق مشغول باشد[۱۱۵]"۔ حضرت گیسو درازؒ نے اپنے زمانے پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ "تخم نیکی درین زمانہ اگر بکارند بر نیاید .... اما تخم بدی ناکشتہ برمی آید" (جوامع الکلم ص ۳۰۲) اور روزی کا یہ حال تھا کہ حلال کا لقمہ کھانا تقریباً محال معلوم ہوتا تھا (ص ۳۳۱ جوامع) یہ دونوں اوصاف حمیدہ ہمارے زمانے میں اور بھی پھلے پھولے ہیں۔

اُس وقت بدی اور اکلِ حرام اپنی اصلی شکل میں سامنے آجاتے تھے اور آج اُن کے چہرے پر ستّر نقابیں ہوتی ہیں۔

آج کا معاشرہ یہ ہے کہ انسان کے ضمیر کی آواز مشینوں کی گڑگڑاہٹ

میں گم ہوگئی ہے۔ ایمان کا خداوندی نور، بجلی کی آنکھیں خیرہ کردینے والی روشنی میں دب رہا ہے بقول اکبر :

برق کے فیض سے اللہ بچائے ہم کو
روشنی آتی ہے اور نور چلا جاتا ہے

روپے کی افراط، تعیّشات اور تنعّمات کی فراوانی، مشینوں کی حکمرانی، مہلک ہتھیاروں کا پھیلاؤ، مختلف فلسفوں اور عقیدوں کا ٹکراؤ، اصطلاحوں کی بھرمار، لفظوں کی یلغار، معانی کی موت ــ اخلاق اب ایک تصوّرِ پارینہ ہے، انسانیت ایک اسمِ بے مسمّٰی اور روحانیت ایک لفظِ بے مدلول۔

شد پریشاں خوابِ من از کثرتِ تعبیرہا

فلسفے نے شکوک لاکھوں پیدا کردیے ہیں، جواب ایک کا بھی نہیں دے سکا۔ اپنے دام میں خود گرفتار ہوگیا ہے۔ سائنس مظاہر کی علتیں دریافت کرنے چلی تھی مگر یہاں تہ در تہ اسرار ہیں، ایک عُقدہ کھلتا ہے تو دس نئے عقدے اور نظر آجاتے ہیں۔ "مذہب" رسوم وظواہر کا شکار ہوگیا ہے۔ صرف خول اور ڈھانچا باقی ہے۔ روح غائب۔ تشکیک، بے یقینی، انتشار اور تضاد کی اس دنیا میں جسم کی پرورش کے لیے تو بہت کچھ ہے، روح کی غذا کہیں نہیں۔ وہ پیاسی ہے، اِس لیے ہر سراب کے پیچھے بھاگتی ہے بقول عرفی :

ز نقصِ تشنہ لبی دان بعقلِ خویش مناز
دلت فریب گر از جلوۂ سراب نخورد

آج یورپ اور امریکہ جیسے ترقی یافتہ ملکوں میں اِس روحانی پیاس کا یہ حال ہے کہ

جن عقائد اور فلسفوں پر مذہب کے تمسخر کا شبہ ہوتا ہے، انھیں بھی وہاں شوکت اور طاقت حاصل ہو رہی ہے۔ روحانیت کی دُکانیں کھُلی ہوئی ہیں۔ روحانی غذا کے نام سے مسموم اور مُہلک چیزیں نہایت خوبصورت پیکنگ میں آ رہی ہیں۔ بھوک سے ڈورائے ہوئے انسانوں کو اتنا ہوش کہاں ہے کہ ان فلسفوں کو چھان پھٹک کر بھی دیکھیں یا انھیں عقل و استدلال کی کسوٹی پر کسیں۔

آج وہ وقت تھا کہ چشتی خانقاہوں کا جال ہندستان سے نکل کر یورپ اور امریکہ کی سرزمین تک پھیلایا گیا ہوتا، حضرت بابا فرید گنج شکرؒ، حضرت محبوب الٰہیؒ، حضرت چراغ دہلیؒ، حضرت گیسو درازؒ، حضرت شاہ فخر الدین چشتیؒ، خواجہ سلیمان تونسویؒ، شاہ عبدالہادیؒ امروہی اور حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ جیسے بزرگوں کی تعلیمات کو "عملی" شکل میں اُن روحانیت کے پیاسوں کے سامنے پیش کیا جاتا۔ لیکن کیسا افسوس ہے کہ اب وہ خانقاہیں سُونی پڑی ہیں اور وہ چراغ بُجھ چکے ہیں۔ تصوّف جو سراسر زندگی تھا، جس کی زندگی کا ثبوت صوفیاے کرام کی حرکت و عمل سے ملتا تھا، وہ خود جمود اور تعطّل کی نشانی بن چکا ہے۔ اُس پر "افیم" کی پھبتی کسی جاتی ہے اور "حقائق سے فرار" کا طعنہ دیا جاتا ہے۔ اس لیے کہ اِن مشائخ کی خانقاہوں کے وابستگان اِس پر مطمئن ہیں کہ ہم "منتظمانِ درگاہ" ہیں اور اکرام و اجلال ہمارا حق ہے۔ عرس اور ایصالِ ثواب یا تعویذ اور مناجات سے زیادہ ہماری ذمّہ داری نہیں ہے۔

حالانکہ آج کے تاریخی سیاق میں درگاہوں سے وابستہ حضرات ایسی حالت میں ہیں کہ وہ ایک طرف خود مسلمانوں کی روحانی جلا اور اخلاقی سدھار

میں معاون ہو سکتے ہیں اور اُن کی رہنمائی کر سکتے ہیں، دوسری طرف وہ غیر مسلم برادرانِ وطن سے بہتر تعلقات استوار کرنے میں بڑا رول ادا کر سکتے ہیں کیونکہ ماضی کی تاریخ میں جو تلخیاں ہیں جنھیں افتراق پسند طاقتیں بڑھا چڑھا کر اُچھالتی ہیں، وہ سب بادشاہوں کے کرتوت یا علماء ظاہر کے کارناموں سے متعلّق ہیں۔ صوفیاے کرام کی انسان دوستی، رواداری، خدمتِ خلق اور شفقت و رافت کا اعتراف ہر دور میں غیر مسلم حضرات نے بھی کیا ہے اور وہ آج بھی اِن آستانوں پر عقیدت سے حاضر ہوتے ہیں، حالانکہ اب اُن کے صرف آثار ہی باقی رہ گئے ہیں۔ وہ جانشین جو اپنے اسلاف کے کمالات کا جیتا جاگتا نمونہ ہوا کرتے تھے اور جنھیں دیکھ کر اُن بزرگوں کے حالات کی تصدیق حاصل ہوتی تھی، اب شاید ہی کہیں ملیں۔

دی شیخ با چراغ ہمی گشت گردِ شہر
کز دیو و دَدْ ملولم و انسانم آرزوست
گفتم کہ یافت می نشود جستہ ایم ما
گفت آنکہ یافت می نشود آنم آرزوست

خانقاہوں کے اس چشمۂ فیض کو پھر جاری کرنے کے لیے سوائے دولتِ احساس کے نہ کسی سرمایے اور خارجی وسائل کی پہلے ضرورت تھی، نہ آج ہے۔ اخلاص اور توکّل اس وقت بھی اِس کی اساس تھے، وہی آج بھی درکار ہیں۔ خدمتِ خلق پہلے بھی اس کا نصب العین تھا، اس کی آج بھی اتنی ہی بلکہ اس سے زیادہ ضرورت ہے۔ ہماری کوتاہی سے تصوف یا MYSTICISM

اب صرف ریسرچ کا موضوع ہوکر رہ گیا ہے جیسے یہ بھی "آثار قدیمہ" میں سے کوئی کلاسکی چیز ہو۔ ضرورت اِسے زندہ، متحرک، فعّال اور موثّر بنانے کی ہے۔

(۵) صوفیا کا تصوّرِ عشق :

تصوف کا مقصد ہماری سیرت کو آراستہ کرنا ہے۔ لیکن یہ کام تو 'اخلاقیات' کا بھی ہے اور جب علمِ تہذیب الاخلاق کے اپنے اصول موجود ہیں تو پھر تصوف کی ضرورت کیوں باقی رہتی ہے؟ یہ سوال اُس وقت اور بھی پیچیدہ ہوجاتا ہے جب ہم مذہب اور اخلاقیات کے رشتے پر غور کریں اور دونوں کے اثر و نفوذ اور مقصد و منہاج کو دیکھیں۔ اخلاقیات کے کچھ اصول مذہب کے بنائے ہوئے ہیں جنھیں وہ GOVERN کر رہا ہے اور جس کے لیے قوانینِ شریعت موجود ہیں۔ لیکن کچھ اصول عالمگیر انسانی اقدار کے تصوّرات سے تعلق رکھتے ہیں، جن کی نگرانی ہمارا سماجی اور تعزیری قانون کر رہا ہے۔ اگر

منتہا اور مقصود صرف یہی ہو کہ آدمی ایک اچھّا انسان بنے، جس کے عادات و اطوار پسندیدہ ہوں، جس سے شرّ و فساد کا ظہور نہ ہو، جس کی سیرت پاکیزہ اور خیالات بلند ہوں، وغیرہ۔ تو یہ مقصد مذہب کے ظاہری اتبّاع سے بھی حاصل ہو سکتا ہے، سماجی اور عُرفی قوانین سے بھی۔ بلکہ بغیر مذہب کے بھی اس کا حصول ممکن ہے۔ اگر یہ بات درست نہ ہوتی تو اُس طبقے میں جو ہمارے خیال سے بد مذہب یا سرے سے بے مذہب ہے، کسی نیک اطوار اور بلند کردار انسان کا دستیاب ہونا محالات میں سے ہوتا۔

لیکن میں صوفیاے کرام کی تعلیمات کی روشنی میں یہ کہتا ہوں کہ مذہب عام لوگوں کے، یعنی سب کے لیے ایک طریقِ اصلاح ہے۔ اخلاقیات خواص کے لیے جو اقدار عالیہ کا تصوّر (VISION) اور خیر و شر کی تمیز رکھتے ہیں اور تصوف جسے قدیم اسلامی اصطلاح میں احسان کہتے ہیں، اَخصّ خواص کے لیے ہے۔ جس طرح جسمانی طبیب کے پاس ایک ہی مرض کی متعدّد دوائیں ہوتی ہیں جو اپنی تاثیر میں شدّت کے اعتبار سے مختلف مدارج رکھتی ہیں اور ایک ہی مرض کے ہر مریض کو لازماً ایک ہی دوا نہیں دی جاتی بلکہ اس کے اپنے ظروف و احوال کی رعایت سے علاج تجویز کیا جاتا ہے، اسی طرح مذہب، اخلاقیات اور تصوف کے بھی مدارج ہیں جن کا فائدہ بقدرِ ظرف اور بقیدِ احوال ہوتا ہے۔

حضرت خواجہ نظام الدین اولیا محبوبِ الٰہیؒ نے اس فرق کو ایک

بڑی عام فہم مثال سے واضح کیا۔ فرمایا کہ اگر کسی شخص کے معدے میں درد ہو اور وہ کوئی دوا کھائے تو وہ اثر کرے گی لیکن اگر وہ صرف اوپر اوپر دوا کا لیپ کرتا رہے تو اندر کیا اثر ہوگا ؟ صوفیا کے مراقبے کی اصل یہی ہے۔ ایک حدیث میں آتا ہے کہ " انسان کے جسم میں گوشت کا ایک ٹکڑا ایسا ہے کہ اگر وہ صالح ہے تو سارا وجود صالح ہوگا اور وہ فاسد ہے تو سارا بدن فاسد ہوجائے گا ، جان لو کہ وہ قلب ہے۔" " مراقبہ " کے لفظی معنی نگرانی کے ہیں۔ اور یہ قلب کی نگرانی ہے یعنی اس پر ہر وقت گہری نگاہ رکھی جائے کہ فساد پیدا کرنے والا کوئی عنصر اس میں داخل نہ ہونے پائے۔ بُغض ، کینہ ، حسد ، ریا کاری ، نفاق ، جاہ پسندی ، خودبینی ، شہواتِ نفسانی ، لذّاتِ دُنیا کی خواہش ، غرض ہزاروں منفی جذبات ایسے ہیں جو چپکے چپکے اپنا نفوذ کرتے رہتے ہیں اور انسانی شخصیت کی ساری عمارت کو اندر سے کھوکھلا کر کے رکھ دیتے ہیں۔ اِن "منفی جذبات" کا شمار کرنا مشکل ہے۔ اِسے مثال میں یوں سمجھ سکتے ہیں کہ ایک گہرا گھنا جنگل ہے جس میں گھنی گھنی جھاڑیاں ، بیلیں ، گھاس پھوس ، بڑے بڑے درخت اور نہایت باریک باریک ریشوں والی گھاس ہے جس نے سارے ماحول کو ڈھانپ رکھا ہے۔ اب اگر اُسے صاف کرنے بیٹھیں تو موٹے موٹے درخت کاٹنے میں ہی عمر تمام ہوجائے گی ، پھر بھی کروڑوں اقسام کی گھاسیں اور بیلیں باقی رہ جائیں گی جو اگر اِس وقت اُکھاڑ بھی دیں تو اُن کی جڑیں آیندہ پنپیں گی اور چند برسوں کے بعد معلوم ہوگا کہ وہ جنگل

بدستور موجود ہے۔ لیکن اُسی جنگل میں اگر آگ لگا دی جائے تو آناً فاناً سب چیزوں کو بھسم کر کے رکھ دے گی اور ہمیں اپنا مقصود حاصل ہو جائے گا۔ اصطلاحاتِ صوفیہ میں "عشق" کو آگ سے ہی تشبیہ دی جاتی ہے۔ یہ ایک ایسا مثبت جذبہ ہے جو سارے منفی جذبات کو ختم کر دیتا ہے اور جہاں یہ پنپنے لگے وہاں پھر اور کسی کا گذر نہیں ہوتا۔ ظہوری نے کہا ہے:

شد است سینہ ظہوری پُر از محبّتِ یار
برائے کینۂ اغیار در دِلم جا نیست

مجاہداتِ صوفیہ میں عشق کی آتش افروزی ایک ایسا عمل ہے جسے انسان کے باطن کی اصلاح و تربیت کا بہترین اور مؤثر ذریعہ مانا گیا ہے۔ تصوّف کی ایک بہت عام اصطلاح ہے: "المجازُ قنطرۃ الحقیقۃ" (یعنی مجاز حقیقت کی سیڑھی ہے) اس قول کو عموماً غلط سمجھا جاتا ہے اور کبھی کبھی اس کی وجہ سے صوفیا کو مطعون بھی کیا جاتا ہے کہ وہ حقیقت کی آڑ میں عشق مجازی کا جواز تلاش کرتے ہیں۔ بعض جُہّال صوفیا، جو صرف مشائخ کی سی شکل بنا کر بیٹھ جاتے ہیں اور نہ حقیقت کی حقیقت سے واقف ہیں نہ مجاز کی حدود سے، وہ بھی معترضین کو اعتراض کرنے کے مواقع دیتے ہیں۔ لیکن مشائخ صوفیا نے جو محبّتِ پیر کی تعلیم دی ہے، وہی اس قول کا راز ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب دل میں عشقِ الٰہی رہے گا تو پھر پیر کی محبّت کہاں سمائے گی؟ اُن کا جواب یہ قول ہے کہ پیر کی محبّت، محبّتِ مجازی ہے۔ اگر پیر سچّا ہے اور اس کا قلب محبّتِ حق سے سرشار ہے تو

مُبتدی کو پہلے اُس کی محبت سے محبّتِ حق کی مشق کرنی چاہیے۔ پھر وہ منزل آجائے گی جہاں محبّتِ پیر، محبّت حق میں ضَم ہوجاتی ہے اور آخری درجے میں تو خود محبّ و محبوب کی اضافت بھی ختم ہوجائے گی۔ عشق یا اس سے مشتق کوئی لفظ قرآن میں نہیں آیا ہے کیونکہ عشق کی ماہیت میں بے کسی، درماندگی، عجز و بے چارگی کا تصوّر بھی شامل ہے اور قرآن میں کہا گیا ہے: هَلْ جزاءُ الاحْسانِ اِلّا الاحْسان۔ احسان (جو تصوّف کا اسلامی نام بھی ہے) اس کا بدلہ احسان ہی ہوسکتا ہے۔ تو ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ بندوں سے عشق نہیں کرسکتا وہ محبّت کرتا ہے۔ یُحبّہم و یُحبّونہ۔ اور اِنّ اللہ یُحبّ المحسنین۔

سوال یہ ہے کہ پھر صوفیا نے عشق کیوں اختیار کیا اور اسے محبّت پر فضیلت کیوں دی۔ ایک تو عشق کی کیفیات میں جو اضطراب و اضطرار، بے قراری، بے چارگی، والہانہ پن اور بے خودی کی کیفیت ہے اس کا مقتضیٰ یہ ہے کہ بندہ اللہ سے عشق ہی کرے۔ یہاں عقل سے زیادہ جذبے کو دخل ہے اور محبّت میں ذات و صفات کا عرفان یعنی عقل شامل ہے۔ اور عشق یہ ہے کہ "پیرِ من خس است، اعتقاد من بس است"۔ تو اللہ بندوں سے محبّت کرتا ہے اور بندوں کو اس سے "عشق" کرنا چاہیے۔

دوسرے یہ کہ انسان اشرف المخلوقات ہے اور دوسری تمام جاندار مخلوقات سے جو جذبہ اُسے ممتاز کرتا ہے وہ "عشق" ہی ہے۔ جانوروں میں کوئی ایک دوسرے سے عشق نہیں کرتا۔ یہ صفت امتیازی حضرتِ انسان ہی کی ہے اور جو وجہِ امتیاز ہے اُسی جذبے کو ممتاز اور انسان کی ساری

شخصیت پر حاوی رہنا چاہیے۔ قرآن کریم میں ہے : اِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ فَأَبَيْنَ أَنْ يَحْمِلْنَهَا وَحَمَلَهَا الْإِنْسَان صوفیا کہتے ہیں کہ یہ امانت جو آسمان و زمین کو پیش کی گئی تھی اور جسے انھوں نے اُٹھانے سے معذوری ظاہر کردی تھی "عشق" ہی کی امانت تھی ؎

سب پہ جس بار نے گرانی کی
اُس کو یہ ناتواں اُٹھا لایا

امانت کی ذمّہ داری یہ ہے کہ اس میں خیانت نہ ہو۔ اگر عشق خداوندی میں "عشقِ غیر" شامل ہوگیا تو یہ خیانت کہلائے گی۔ اب یہ وہی ازلی امانت ہے جو نسبتِ باطن کی صورت میں سینہ بسینہ منتقل ہوتی ہے اور جسے صوفیا "نعمت" سے تعبیر کرتے ہیں۔ مرید کا کام یہ ہے کہ وہ اپنے اندر استعداد پیدا کرے تاکہ اُس کا سینہ اِس امانت کے قابل بن جائے اور پیر کا کام یہ ہے کہ وہ سوکھی لکڑیوں میں ایک چنگاری رکھ دے جسے مرید ذکر و فکر اور مراقبہ و مجاہدہ کے ذریعے ہوا دیتا رہے کہ وہ چنگاری بجھ نہ جائے۔ یہ نعمت ازلی اور لافانی ہے جب پیر خود اس جاذبۂ حق کی مدد سے حق تک واصل ہوجاتا ہے تب وہ یہ نسبت باطنی اپنے جانشین کے لیے چھوڑ جاتا ہے جسے خلیفہ کہتے ہیں۔ اگر یہ نعمت اور یہ نسبت کسی خوش نصیب کو ملی ہے تو وہ پیر کا جانشین بھی ہے، سجادہ نشین بھی، خلیفہ بھی، قائم مقام بھی، وارث بھی اور اہل سلسلہ بھی۔ ورنہ قرآن کریم نے حضرت نوحؑ جیسے برگزیدہ نبی کی آنکھوں کے سامنے ان کے بیٹے کو ڈوب جانے دیا اور کشتی میں بٹھانے کی

اجازت نہیں دی۔ کیونکہ اِنّہ لیسَ منْ أهلكَ اِنّہ عملٌ غیرُ صالحٍ۔

بندۂ عشق شدی ترکِ نسب کُن جامی

کاندریں راہ، فلاں ابنِ فلاں چیزے نیست

لہذا ان مشائخ کے بارے میں یہ نکتہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ ان کا "وارث" وہی ہوتا ہے جسے اُن کی "نعمت" میں سے حصّہ ملا ہو۔ حضرت ابوبکر صدیق نے یہ حدیث فرمائی تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: نحن مَعْشرالانبیاء لانُوْرث کل ماترکہ صدقہ ۔ تو اس کا مفہوم یہ بھی ہوسکتا ہے کہ نبوت وراثت میں نہیں ملتی اور نبی جو کچھ میراث چھوڑتا ہے وہ صدقہ ہوتی ہے۔ صدقہ کا فائدہ ہر ضرورت مند کے لیے ہے، جو چاہے اُسے حاصل کرے۔ جب نبوت وراثت میں نہیں چلتی تو ولایت جو اُس سے کمتر درجے کی چیز ہے کیسے چل جائے گی۔ جب انبیاء جو کچھ چھوڑیں گے وہ سب کے لیے صدقہ (CHARITY) ہوگا تو کیا اولیاء اپنی میراث محض چند لوگوں کے پالنے پوسنے کے لیے چھوڑ جائیں گے؟ ظاہر ہے کہ اُن کی میراث بھی ایک صدقۂ جاریہ ہوگی۔

انبیاء کا صدقہ رشدوہدایت ہے اور اولیاء کا صدقہ یہ "نسبتِ عشقی" ہے۔ جس کے پاس کوئی دولت یا ثروت ہوتی ہے وہ طرح طرح سے اس کی حفاظت کرتا ہے۔ سرمائے کے تحفظ کا ایک طریقہ سرمایہ کاری بھی ہے اور اس دولت باطن کو اس طرح تقسیم کرنے کا فلسفہ بھی یہی ہے کہ اسے ایک CHARITABLE ENDOWMENT سمجھا جائے تاکہ اس کا فائدہ

ساری انسانیت کے لیے عام ہوسکے۔ یہ نعمت صرف کسی شخص، کسی گروہ، یا کسی خاندان میں محدود ہوکر نہ رہ جائے۔

صوفیا کے نزدیک عشق ایک ایسا دقیق، ایسا رقیق، ایسا شدید، موثّر اور اتنا سریع النفوذ جذبہ ہے کہ وہ ہر ABSTRACT سے زیادہ مبہم ہے۔ جس طرح آپ کسی بہت پیچیدہ مشین کو بغیر اُستاد سے ٹریننگ لیے نہیں چلا سکتے، یا کسی بہت قوی تاثیر والی دوا کو ماہر طبیب کے مشورے کے بغیر نہیں کھا سکتے، اسی طرح یہ "کاروبارِ عشق" بھی اگر کسی سالکِ طریقت کی پیروی کے بغیر کیا جائے گا تو آدمی نرا 'مجذوب' بن کر رہ جائے گا۔ سالک اور مجذوب میں فرق یہ ہے کہ ایک شخص کی آنکھوں پر پٹّی باندھ کر آپ نے اُسے کسی سواری میں لادا، اور ایک نہایت خوشنما و پُرفضا مقام پر پہنچا دیا، جہاں آنکھیں کھولیں تو وہ بھونچکّا ہوکر رہ گیا۔ دوسرے نے باقاعدہ سفر کی تیاری کی، سامان باندھا، زادِ راہ ساتھ لیا، ٹکٹ خریدا، ایک گائڈ کو اپنے ساتھ رکھا اور راستے کی سیر کرتا ہوا، تمام نشیب و فراز دیکھتا ہوا اپنی منزل مقصود تک پہنچا۔ وہاں جاکر وہ خوش ضرور ہوگا، بھونچکّا نہیں بنے گا۔ پھر پہلا شخص جسے آنکھوں پر پٹّی باندھ کر لایا گیا تھا کسی دوسرے کو اس مقام تک نہیں لاسکتا۔ وہ تو یہ کہے گا کہ میں اس ترکیب سے وہاں گیا تھا۔ اب تم بھی منتظر رہو کہ کوئی تمھیں بھی اسی طرح وہاں پہنچا دے۔ اور جو شخص خود سفر طے کرکے گیا ہے وہ اس منزل تک جانے کے خواہش مندوں کو راستے کی ساری تفصیل بتا دے گا اور

یہ بھی سمجھا دے گا کہ اس سفر میں کون کون سے شدائد سے سابقہ پڑ سکتا ہے۔ مجذوب کا کام سالک تو کر سکتا ہے کہ کسی کو آناً فاناً اور بے مجاہدہ منزلِ مقصود تک پہنچا دے، مگر سالک کا کام مجذوب نہیں کر سکتا کیونکہ یہ راستہ اس کا دیکھا ہوا نہیں ہے۔

مریضوں کا علاج ایک اَتائی بھی کرتا ہے اور حاذق طبیب بھی۔ دو چار مریض اَتائی کے ہاتھ سے شفایاب بھی ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح دو چار طبیبِ حاذق کے ہاتھ سے مر بھی جاتے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ طبیبِ حاذق ہی سے علاج کرانا کیوں ضروری ہوا؟ اس کا حکیم محمود خاں مرحوم نے بہت مختصر مگر محققانہ جواب دیا تھا۔ انھوں نے کہا کہ وہ دو چار آدمی جو ہمارے علاج سے مر جاتے ہیں اُنھیں ہم اصول کے تحت مارتے ہیں اور اَتائی اُنھیں بے اصولی سے مارتا ہے!

روحانی علاج میں بھی ایسے بہت سے نازک موڑ آتے ہیں کہ وہاں مصنوعی پیر خود بھی ڈوبے گا اور مرید کو بھی لے ڈوبے گا۔ پیر کی تین قسمیں بتائی گئی ہیں ایک پیر "پتّا" جو خود تیر سکتا ہے دوسری کسی چیز کو نہیں تِرا سکتا۔ دوسرا پیر "پتّھر" ہوتا ہے جو خود بھی ڈوبتا ہے اور اپنے ساتھی کو بھی ڈبوتا ہے۔ بقول شخصے: ہم تو ڈوبے ہیں صنم تجھ کو بھی لے ڈوبیں گے! تیسری قسم ہے پیر "لکّڑ"۔ جو خود بھی تیر سکتا ہے اور دوسرے کو بھی نہیں ڈوبنے دے گا۔ حضرت نظام الدین اولیاء کے مریدوں میں ایک بزرگوار حاجی محمّد تھے۔ یہ حج سے مشرّف ہو چکے تھے۔ اس زمانے کا حج بھی ایک

زبردست مجاہدہ ہوتا تھا۔ کفنی آج کل تو رسماً ساتھ رکھ لی جاتی ہے اُس وقت سب سے پہلے اسی کی ضرورت پڑ جاتی تھی۔ بہرحال جب حاجی محمدؐ حج سے واپس آئے تو عجب درد وسوز اور بے قراری وشیفتگی محسوس کرتے تھے اور اضطراب نے اضطرار کی صورت اختیار کر لی تھی۔ ایک دن انھوں نے حضرت قاضی محی الدین کاشانی علیہ الرحمۃ سے عرض کیا کہ آپ حضرت شیخ کی خدمت میں تشریف لے جائیں تو انھیں میری کیفیت سے آگاہ فرمادیں۔ میں جب سے حج کرکے آیا ہوں عجب بے قراری کے عالم میں رہتا ہوں۔ حضرت سے درخواست کریں کہ وہ مجھے پڑھنے کے لیے کوئی وظیفہ بتا دیں۔ قاضی صاحب نے ان کا حال حضرت نظام الدین اولیاؒ کو بتایا تو حضرت نے فرمایا: ایسے شخص کو دو میں سے ایک کام کرنا چاہیے یا تو وہ کسب وحرفت میں، یعنی کمانے میں یا کسی ہُنر میں لگ جائے اور اپنی وجہِ معاش پیدا کرے۔ یا پھر یک سو ہو کر گوشہ نشینی اختیار کرلے اور صرف یادِ حق سے سروکار رکھے۔ پہلی صورت میں "دل بیار و دست بکار" والا معاملہ ہوگا اور دوسری صورت میں انقطاعِ کُلّی ہو جائے گا۔ بعض وقت بے قراری کی کیفیت دو دِلے پن سے بھی پیدا ہوتی ہے۔ اس بات کو ایک نہایت ماہر اور محقّق شیخِ وقت ہی محسوس کرسکتا ہے۔ میں نے حکیم اجمل خاں مرحوم کے سوانح میں یہ واقعہ پڑھا تھا جس سے حکیم صاحب کی فنّی حذاقت ظاہر ہوتی ہے کہ اُنھوں نے ایک مولوی صاحب کے لیے مُسہل تجویز کیا اور اُن سے کہا کہ صبح کو یہ دوا کھا لینا۔ دوپہر تک دو تین بار اسہال ہو جائیں گے اور طبیعت کشادہ ہو جائے گی۔

مولوی صاحب دوا کھا کر منتظر رہے، لیکن بارہ ایک بجے تک اُس کا کوئی اثر ظاہر نہ ہوا تو انھوں نے اپنے آدمی کو حکیم صاحب کے پاس بھیجا اور کہلوایا کہ دوا نے کوئی اثر نہیں کیا ہے۔ اگر کوئی اناڑی طبیب ہوتا تو وہی دوا ایک خوراک اور تجویز کر دیتا یا اس سے بھی زیادہ سخت کوئی دوا بتا دیتا۔ حکیم صاحب نے قاصد سے پوچھا کہ مولوی صاحب کیا کر رہے ہیں؟ اُس نے کہا کہ لیٹے ہیں۔ حکیم صاحب نے کہا۔ اُن سے کہو کہ حسبِ معمول کتاب پڑھیں۔ مولوی صاحب نے کتاب اُٹھا کر ابھی دو چار ہی صفحے مطالعہ کیے ہوں گے کہ "قُرقُر" شروع ہوگئی اور دوا کا اثر ظاہر ہوگیا۔ بعد کو انھوں نے بڑی حیرت سے حکیم صاحب سے پوچھا کہ مطالعہ کا اسہال سے کیا تعلّق ہے؟ حکیم صاحب نے کہا کہ آپ دوا کھا کر اس کے اثر کے انتظار میں بیٹھے تھے اس لیے طبیعت میں حیرانی پیدا ہوگئی تھی۔ جب آپ نے اپنا کام شروع کیا تو طبیعت اپنے کام میں لگ گئی!

طبیب جسمانی علاج کرتا ہے، شیخ اور مرشد روحانی معالج ہوتا ہے۔ جسمانی علاج میں ایسی ایسی فنّی باریکیاں ہیں تو ظاہر ہے کہ روحانی امراض کی باریکیاں اور بھی زیادہ دقیق ہوں گی۔ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ محبوب الٰہی کے طریقِ سلوک و تربیت کو اگر فنّی اور تحقیقی نگاہ سے دیکھا جائے تو ہم جیسے بے بصر بھی یہ اندازہ کر سکتے ہیں کہ آپ ایک روحانی معالج، ایک ہادی طریقت اور سالکِ حقیقت کی حیثیت سے اُس بلند مقام پر فائز تھے، جہاں تک صوفیا کی پوری تاریخ میں شاید صرف چند حضرات ہی پہنچ سکے ہوں گے۔

حاجی محمد کا حال سُن کر حضرت نے فرمایا کہ عبادت و ریاضت میں بھی اُسی

وقت مزہ ملتا ہے جب عشق و درد کی چاشنی طبیعت میں ہو۔ ورنہ عبادت ہو یا وجہِ معاش میں مشغولی، دونوں میں اعضا و جوارح کا عمل ہے۔ گویا نماز پڑھنا یا لکڑی کو رَندہ کر کے چوکھٹ کواڑ بنانا، برابر کے عمل ہیں، اس لیے کہ دونوں اعضا ہی سے سرزد ہو رہے ہیں۔ عشق اور درد کی چاشنی پیدا کر لے گا تو عبادت میں خود بخود لذّت نصیب ہو جائے گی۔ اس کی مثال یوں ہے کہ ایک شخص بڑھئی کا کام کرتا ہے اور مثلاً کرسی بنا رہا ہے، تو اِس کام میں اُسے کوئی ذوق اور لذّت نصیب نہیں ہے بلکہ وجہِ معاش کے لیے کر رہا ہے۔ لیکن یہی کرسی اگر وہ اپنے محبوب کے بیٹھنے کے لیے بنا رہا ہے تو بناتے وقت اُس پر ایک وجد کی سی کیفیت طاری ہو جائے گی اور اس کے بنانے میں ایسا منہمک رہے گا کہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جائے گا۔ یہی حال عبادت کا ہے۔ خالی عبادت کرنا محض اعضا کی ورزش ہے لیکن اگر عبادت کرنے والے کو معبود سے دِلی تعلّق بھی ہے جسے "عشق" کہتے ہیں، یا وہ جانتا ہے کہ وہ کس عظیم اور محبوب ہستی کی بارگاہ میں حاضر ہوا ہے تو وہی عبادت "وجد و شوق" میں تبدیل ہو جائے گی۔ گویا عبادت کی روح بھی "عشق" ہے۔ یہ عشق جس طرح حیوانوں میں نہیں ہے اسی طرح ملائکہ میں بھی نہیں ہے۔ حضرت نظام الدین اولیاؒ نے فرمایا کہ اگر ازل کے دن ابلیس نے آدم کو سجدہ کرنے سے انکار کیا تو اس کا سبب یہ تھا کہ اس میں "عشق" کا جذبہ نہیں تھا ورنہ اپنے محبوب کے حکم کی تعمیل سے سرتابی نہ کرتا۔ جہاں عشق ہوگا تو وہ قاصد کی بات پر بھی آمادۂ عمل ہو جائے گا۔ (اقبال):

عشق فرمودۂ قاصد سے سبک گام عمل
عقل سمجھی ہی نہیں معنیِ پیغام ابھی

اتّباع شریعت یعنی اتّباع رسول کا نکتہ یہی ہے کہ " فرمودۂ قاصد" کو "فرمودۂ مقصود" سمجھا جائے۔ اور اس نکتے کو قرآن نے بالکل واضح لفظوں میں بیان کر دیا ہے۔ مَا اٰتٰکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْہُ وَمَا نَہٰکُمْ عَنْہُ فَانْتَہُوْا۔ اور وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْہَوٰی اِنْ ہُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی۔

محبّت کے بارے میں حضرت محبوب الٰہی کا ارشاد ہے کہ یہ دو طرح کی ہوتی ہے۔ ایک محبتِ ذات، دوسری محبّتِ صفات۔ محبّتِ ذات مَوہَبتِ الٰہی ہے، جسے بھی نصیب ہو جائے۔ اس میں کوشش اور مجاہدے کو دخل نہیں۔ البتہ محبّتِ صفات کسب کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔ اور تصوّف کا مقصود "محبّتِ صفات" کا حاصل کرنا ہے۔ جب یہ معلوم ہے کہ خدا علیم ہے، خبیر ہے، رازق ہے، خالق ہے، قہّار ہے، مُحی ہے، مُمیت ہے، تو اُس کی اِن صفات کا عرفان، جو خدا کی شانیں ہیں اور اُس کی اِن شانوں سے محبّت پیدا کی جائے، جب وہ کسی درجے میں بھی حاصل ہو جائے تو مَنْع وعطا، موت وزیست، محرومی اور ثروت، سعادت اور شقاوت سب کو اُسی کے اسماء کا ظہور اور اُسی کی شان کی تجلّی جانے گا۔ یہاں سے مرتبہ تسلیم و رضا کا حاصل ہوگا۔

اب سوال یہ ہے کہ محبت صفات حاصل کرنے کا طریقہ کیا ہے؟ اس کے لیے ذکر تجویز کیا گیا ہے۔ ذکر کی شرط یہ ہے کہ اس میں دوام ہو تاکہ

غفلت نہ ہونے پائے۔ دوام کا خاصہ یہ ہے کہ وہ قلب کو ماسوا سے بالکل خالی کردے گا اور جب قلب میں تخلیہ ہوجائے گا تو پھر تزکیہ کا عمل شروع ہوگا جو آخر میں تجلیہ ہوجائے گا۔ یعنی وہ آئینۂ جمالِ الٰہی بن جائے گا۔ حضرت محبوب الٰہی نے فرمایا کہ فراغ خاطر کے بغیر مقصود حاصل نہیں ہوتا اور فراغ کے حاصل ہونے میں چار چیزیں حارج ہوتی ہیں۔ ایک دنیا، دوسرے نفس، تیسرے شیطان اور چوتھے خلق۔ دنیا سے مراد یہاں کی دولت و ثروت، عیش و آرام اور جاہ و منصب ہے۔ نفس امّارہ بالسوء ہے جو بُرائی کرنے پر اُبھارتا رہتا ہے۔ شیطان وہ شر کی قوت ہے جو وقتی منفعتیں دکھاتی ہے اور لالچ دے کر ورغلاتی ہے۔ خلق میں رشتے ناتے آل اولاد سب آجاتے ہیں۔ قرآن نے اِن چار موانع کو اور اختصار کے ساتھ دو ہی میں بیان کردیا ہے لَا تُلْهِكُمْ اَمْوَالُكُمْ وَلَا اَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ۔ (تمھارے اموال اور تمھاری اولاد تمھیں اللہ کی یاد سے غافل نہ کردیں)۔

(۵) عقل اور عشق:

"اصلِ خلقت و رأسِ حکمت ہمیں محبت و معرفت آمدہ"

(حضرت گیسو درازؒ)

صوفیائے کرام نے 'عشق' کو 'عقل' کے مقابلے میں پیش کیا ہے۔ ہمارے عہد کے شاعر علّامہ اقبال نے اسے ایک اہم اور بنیادی شعری علامت کے طور پر

استعمال کیا ہے۔ وہ عقل وعشق کا فرق اس طرح بیان کرتے ہیں :

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی
عشق فرمودہ قاصد سے سبک گامِ عمل
عقل سمجھی ہی نہیں معنیِ پیغام ابھی

صوفیا کے نزدیک عشق طلبِ مولیٰ اور ترکِ خویش کا نام ہے۔

عقل گوید دنیا و عقبیٰ بجو
عشق می گوید بجز مولیٰ مجو
عقل می گوید کہ خود را بیش کن
عشق می گوید کہ ترکِ خویش کن

لفظی اعتبار سے غور کیجیے تو عشق اور عشیقہ وہ بیل ہے جو کسی درخت سے لپٹ جاتی ہے اور پھر اُسے پنپنے نہیں دیتی۔ اس لیے عشق وہ جذبہ یا کیفیت ہے کہ جب انسان پر طاری ہوتی ہے تو نفس کی ساری کدورتوں اور کثافتوں کو جلا دیتی ہے اور منافست، خود بینی، تن پروری، کینہ، حسد، بغض و عداوت، مکر و دغل جیسے ذمائم اخلاق کی جڑیں خشک کر دیتی ہے۔ جب حضرتِ عشق کا استیلا ہوتا ہے تو ساری نفسانی اور شیطانی قوتیں مغلوب و مقہور ہو جاتی ہیں۔ اس طرح خانۂ دل اغیار سے خالی ہو کر یار کی منزل بننے کے قابل ہو جاتا ہے۔ اسی کو ظہوری نے یوں کہا ہے :

شداست سینہ ظہوری پُر از محبّتِ یار برائے کینۂ اغیار در دلم جا نیست

صوفیا کے نزدیک عشق ہی اصلِ مطلوب ہے۔ یہ ایسا درد ہے جو ہر درد کا درماں بن جاتا ہے۔ مولانائے رومؒ فرماتے ہیں :

مرحبا اے عشقِ خوش سودائے ما

اے طبیبِ جملہ علّت ہائے ما

اے دوائے نخوت و ناموسِ ما

اے تو افلاطون و جالینوسِ ما

نخوت و ناموس، پندار و تکبّر، عُجب و غرور محض دھوکے ہیں۔ غرور، خود عربی میں دھوکے کو کہتے ہیں۔ اور اس دھوکے میں پڑ کر انسان وہ سب کچھ کرتا ہے جو اُسے دوسروں کو ایذا دینے، ظلم کرنے اور شقاوت اختیار کرنے پر آمادہ کرتا ہے۔ صوفیا کہتے ہیں کہ پہلے مرحلے میں عشق کو استقامت "ذکر" سے حاصل ہوتی ہے۔

۱۔ ذِکر کی حکمت : ذکر میں تکبیر کہنا، تسبیح کرنا اور اللہ کی حمد کرنا ہے جس سے مقصود یہی ہے کہ انسان بار بار صبح و شام وِرد کر کے خوب اچھّی طرح یہ ذہن نشیں کر لے کہ " اللہ اکبر "یعنی حقیقی اور سچّی بڑائی صرف اللہ ہی کے لیے ہے۔ عربی قاعدے کی رُو سے یہاں "اکبر" کے بعد مِن کُلِّ شَیءٍ محذوف ہے یعنی اللہ کائنات کی ہر معلوم و موجود شے سے بڑا ہے اور " سبحان اللہ" کا وِرد کرے تو یہ ذہن نشیں ہو جائے کہ اللہ ہر عیب و اضافت سے پاک ہے۔ کوئی انسان اپنے تقدّس کا، اپنی بے نیازی اور بے احتیاجی یا ذمائم اور معاصی کی آلودگیوں سے

اپنے پاک ہونے کا گھمنڈ نہ کرے۔

الحمدللہ کہے تو سمجھ لے کہ اللہ کی حمد و شکر کا حق وہ ادا نہیں کر سکتا، یہاں بھی اس کی نحوی ترکیب پر غور کیجیے تو الحمد میں الف لام جنس کا کہلاتا ہے، یہ احاطتِ جنس کے لیے آتا ہے۔ یعنی جس لفظ کو اس سے مختص کیا گیا اُس کے نوع و قبیل کی ہر شے مراد ہو جاتی ہے۔ لہٰذا جب الحمد کہا تو ہر وہ چیز یا بات جس پر کسی بھی طرح سے حمد کا اطلاق ہو سکے خواہ وہ حمد کوئی بھی کرے اور کسی بھی اصطلاح یا زبان میں کرے، در اصل وہ خدا کے لیے ہو گی۔

سندیاں را اصطلاحِ سند مدح
ہندیاں را اصطلاحِ ہند مدح

وہ حمد کسی کی بھی ہو اُس کا حقیقی مرجع ذاتِ خداوندی ہی ہو گی۔ قرآنِ حکیم نے کہا ہے:

قُلْ لَوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِكَلِمَاتِ رَبِّي لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمَاتُ رَبِّي وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهِ مَدَدًا ۝

اب کلماتِ ربّی کی شرح و تفسیر دیکھیے تو اس سے ذاتِ الٰہی کی صفاتی شانیں اور اس کی صفات کی تجلیات مُراد ہیں جو اس کے خالق اور رازق اور حی و قیوم ہونے پر دلالت کرتی ہیں۔ انھیں صوفیا "تجلیاتِ اَسمائے الٰہی" کہتے ہیں۔ ہم پیدا ہوئے تو یہ خدا کی صفتِ خالقیت کی تجلّی ہے۔ زندہ ہیں تو یہ اُس کی صفتِ رزاقی کا جلوہ ہے۔ مریں گے تو یہ اس کی مُمیت ہونے کی شان ہے۔ ان شانوں کا عدّ و احصا ممکن نہیں۔ كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَاْنٍ ۝

۲۔ کثرتِ ذکر کا فلسفہ: شیخ سعدی نے گلستاں کے آغاز ہی میں لکھا ہے: "منّت مر خدائے راعزّ وجل که طاعتش موجبِ قربت است و باعثِ ازدیادِ نعمت ۔ ہر نفسی که فرو می رَوَدْ ممدِّ حیات است و چون برمی آید مُفرّحِ ذات، پس در ہر نفسی دو نعمت مَوجُود است و بر ہر نعمت شکرے واجب"۔

اِس سے انھوں نے یہ بھی ثابت کر دیا کہ جو اللہ کی اطاعت وعبادت کرنے والے بندے ہیں اُن پر حمد وثنا کی ذمّہ داری بھی زیادہ ہوجاتی ہے۔ کیونکہ طاعت مُوجبِ قربت بھی ہے اور باعثِ ازدیادِ نعمت بھی۔ چونکہ وہ زیادہ شکر کرتے ہیں۔ اللہ اپنے وعدۂ صادق کے بموجب (لئن شکرتُم لَاَزِیدَنَّکُمْ) ان کے لیے اپنی نعمتوں کو اور بڑھاتا جاتا ہے اور جتنا نعمتوں میں اضافہ ہوتا ہے اتنا ہی شکر زیادہ واجب ہوتا ہے۔ اس لیے ان کا ہر بُنِ مو زبان بن کر ہمہ وقت شکر ادا کرتا رہے تب بھی وہ اس کا ذرّہ بھر حق ادا نہیں کر سکتے اور چونکہ یہ نکتہ اُن کے علم میں ہوتا ہے کہ ہم سے حقِ نعمت ادا کرنا ممکن نہیں، اس لیے اپنی کوتاہی اور تقصیر اور عاجزی و درماندگی کا انھیں اعتراف ہوتا ہے اور خدا کی محبّت اور خوف و خشیّت میں بھی اضافہ ہوجاتا ہے۔ اِنَّمَا یَخْشَی اللہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمٰٓؤُا۔

"ذکر" یاد کرنے کو کہتے ہیں۔ انسان کے دل کو جس چیز سے بُعد ہوتا ہے اسے کم یاد کرتا ہے اور جس چیز یا ذات سے تعلّقِ خاطر ہوگا اسے اکثر یاد کرتا ہے۔ مَنْ اَحَبَّ شَیْئاً اَکْثَرَ ذِکْرَہٗ حدیث شریف ہے لہذا

جتنا گہرا ربط و تعلق ہوگا اسی تناسب سے ذکر بھی زیادہ ہوگا۔ قرآنِ کریم نے اولیاء اللہ کی یہی شان بتائی ہے یَذکرونَ اللہَ قِیاماً وَّ قُعُوداً وَّعلیٰ جنوبِھِمْ ہ وہ اللہ کو اٹھتے بیٹھتے اور ہر ہر کروٹ پر یاد کرتے ہیں۔ یہ ذکر بڑھتے بڑھتے محویت اور فنائیت کی منزل میں لے جاتا ہے۔ جب اپنے محبوب کی یاد اور ذکر میں گم ہو جائے گا تو ماسوا کو بھول جانا بالکل فطری بات ہے۔ انسان کے ذہن میں ہمہ وقت خیالات کی مبہم تصویریں گردش کرتی رہتی ہیں جس کو تشبیہ " فانوسِ خیال " سے دی جاسکتی ہے اور غالب نے اسے "محشرِ خیال" کہا ہے۔

ہے آدمی بجائے خود اک محشرِ خیال
ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

نفسیات کا مُسلّمہ اصول ہے کہ ایک شے دوسری شے کو یاد دلاتی ہے اور ایک خیال کا تتبّع دوسرا خیال کرتا ہے۔ مثلاً دوات کا تصوّر کیجیے تو قلم یاد آئے گا۔ پھر کاغذ، پھر کتاب پھر الفاظ و حروف وغیرہ۔ صوفیا نے ذکر اسی لیے اختیار کیا ہے کہ جو مظاہر کائنات کی علتِ اولیٰ ہے، ہمہ وقت وہی یاد رہے اور اللہ کے بعد بھی اللہ ہی یاد آئے۔ اس کے بغیر ھُوَ الاوّل ھُو الآخِر ھُوَ الظاھِر ھُوَ الباطِن کے مقام کا عرفان نہیں ہو سکتا اور جب اس مقام کو سمجھ لیا تو لاموجودَ اِلّا اللہ، لامُؤثّرَ فِی الوجودِ اِلّا اللہ پر اس کا یقین کامل ہو جائے گا۔

۳۔ ذکر کا جواز : یہ لا نفی کا ہے اور اسے نافیہ للجنس کہتے ہیں۔ یہ

خود ذاکر کے وجود کی بھی نفی کر رہا ہے۔ پھر ذکر بھی فنا ہو جاتا ہے کیونکہ وہ بھی حادث تھا، صرف مذکور باقی رہتا ہے کیونکہ اس کا وجود واجب ہے۔ کُلُّ شَیْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ۔ اس "کُلُّ شَیْءٍ" میں ذکر اور ذاکر بھی شامل ہیں۔ صرف "وَجْهِ رَبّ" کو بقا و دوام ہے۔ کُلُّ مَنْ عَلَیْهَا فَانٍ وَّ یَبْقٰی وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْاِكْرَامِ اور اسی وَجْه کی تلاش کا نام تصوّف ہے۔ وَلَا تَطْرُدِ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِیِّ یُرِیْدُوْنَ وَجْهَهٗ، اسی آیۃ میں "یَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ" سے ذکر کا مسئلہ ثابت ہو جاتا ہے۔ اپنے رب کو صبح و شام پکارتے ہیں۔ طریقِ چشتیہ کا "ذکرِ جہر" اس یَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ کے سوا اور کیا ہے؟

شیخ کی صحبت کا لزوم بھی اسی آیۃ کے پہلے ٹکڑے سے ثابت ہے۔ یہاں رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے خطاب ہے کہ ایسے لوگوں کو اپنے پاس سے دُور نہ کیجیے۔ لَا تَطْرُدِ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ ۝ گویا جو مُرید طالبِ مولیٰ ہو اور اِس غرض سے ذکر کر رہا ہو ایک طرف اس کی تربیت و نگہداشت کو اس آیۂ صریح کی رو سے پیرِ سالک پر فرض کر دیا گیا، دوسری طرف مُرید کو یہ حکم دیا کہ کُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ صدق و اخلاص سے عبادت کرنے والوں کا دامن پکڑ لو۔ جنھوں نے منازلِ سلوک طے کر کے مرتبہ صدّیقیت حاصل کر لیا ہے اور اپنی عبادت اور طلبِ رضائے حق میں سچّے اور صادق نکلے ہیں ان کی صحبت اختیار کرو۔ ایک سِرِ شرع، سالکِ طریقت کے پاس خانقاہ میں رہ کر جو ذکر کرتا ہے

اور آیتہ یُرِیدُونَ وَجْهَهٗ کے مصداق صرف "وجہِ مولیٰ" کا طالب ہے کیا وہ کہیں بھی لفظاً یا معناً اس آیتہ کے خلاف کچھ کر رہا ہے؟

ذکر سے منازلِ طلب و تحقیق آسان ہو جاتے ہیں اور قلب میں محبت کی گرمی اور توانائی پیدا ہوتی ہے۔ محبت کی یہی گرمی اور توانائی قلب کی زندگی ہے۔

مجھے یہ ڈر ہے دل زندہ تو نہ مر جائے
کہ زندگانی عبارت ہے تیرے جینے سے

جو دل زندہ ہے وہ گویا صحت مند اور توانا ہے۔ اُسی کو قلبِ سلیم کہیں گے۔ سلیم ضد سقیم کی ہے۔ قلبِ سقیم وہ ہو گا جو مُردہ اور بے حس ہو، جس میں محبت کی گرمی اور عشق کی حرارت نہ ہو جسے کسی اسنیٰ و اعلیٰ مقصد کی طلب و جستجو نہ ہو، جس میں کسی آرزو کی کھٹک نہ ہو۔ بقول اقبالؔ:

طبیبِ عشق نے دیکھا مجھے تو فرمایا
ترا مرض ہے فقط آرزو کی بے نیشی

اگر کسی دل میں آرزو کا کوئی کانٹا نہیں کھٹکتا تو یہ دل کے مریض ہونے کی علامت ہے۔ اگر محبت کی خلش اور کاہش موجود ہے تو عقیدۂ صوفیا کے مطابق یہ قلبِ سلیم ہو گا جس کے لیے قرآنِ حکیم نے واضح لفظوں میں فرمایا ہے: يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ اِلَّا مَنْ اَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ: یعنی روزِ آخرت میں نہ مال و دولت کام آئیں گے، نہ قوم، قبیلہ، اولاد اور اخلاف، اگر کوئی چیز کچھ نفع دے گی تو وہ "قلبِ سلیم" جو ایک بندہ

اپنے رب کے حضور میں لے کر حاضر ہوگا۔ پھر اُس قلب کے سلیم ہونے میں کیا شبہ ہے جس میں "طلبِ وجہِ ربّ" اور محبّت حق کے سوا کسی چیز کا دخل نہ ہو۔

تصوّف کے تمام مجاہدات و مراقبات، اذکار و اوراد کی غایتِ اقصیٰ اسی "قلب سلیم" کا حصول ہے جس چیز کو آپ عیب و سُقم سے بچانا چاہیں گے خواہ وہ آپ کا بدن ہو یا جایداد و املاک ہوں یا فکر و خیالات ہوں، اس کی مسلسل نگرانی رکھنا ضروری ہے۔ صحت کی نگرانی یہ ہے کہ بیماری پیدا کرنے والی ناقص اشیاء کے کھانے سے پرہیز ہو، جایداد کی نگرانی اور حفاظت یہ ہے کہ اُس پر کسی کا ناجائز اور غاصبانہ قبضہ نہ ہونے پائے، نہ کوئی اُسے برباد کرنے کے درپے ہو سکے، مال و زر آپ کی حاجتوں کو پورا کرتا ہے اِس لیے اُس کی نگرانی کی جاتی ہے۔ جتنا بڑا خزانہ ہوگا اُتنا ہی سخت اور مسلسل پہرہ دیا جاتا ہے۔ "قلب سلیم" جو از روے قرآن اتنا بڑا خزانہ ہے کہ قیامت کے دن جب متاعِ دنیا کے سارے وسیلے ناکام اور غیر موثّر ہو جائیں گے۔ لَا یَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْن۔ نہ مال و زر کام دے گا نہ آل اولاد، اُس وقت وہ قلبِ سلیم کام آئے گا، تو اس کی قیمت ظاہر ہے کہ دنیا کے ہر خزانے سے زیادہ ہے۔ ایسی انمول شے کی حفاظت بھی سخت اور مسلسل ہونی چاہیے۔ صوفیا نے اِس کے لیے "مراقبہ" اور "پاسِ انفاس" کے اعمال و اشغال تجویز کیے ہیں۔

۴۔ مراقبہ اور اس کی غایت :

دنیوی مال و دولت اور خزانے کی حفاظت تو ہتھیاروں اور

پہرہ داروں سے ہوجاتی ہے لیکن قلب و روح کی اور اعمال و افکار کی نگہداشت صرف ایک ظاہری عمل نہیں ہے بلکہ یہ باطنی کیفیات ہیں تو ان کی حراست و حفاظت بھی ظاہر و باطن دونوں صورتوں میں ہونی چاہیے۔ آج جسے ہم "روحانی تجربہ" (MYSTIC EXPERIENCE) کہتے ہیں، اس کا دعویٰ دنیا کے تمام مذاہب کرتے ہیں اور اس میں شک نہیں کہ ہر مذہب کے ماننے والے کو اپنے ذوق و ظرف اور علم و عمل کے لحاظ سے یہ روحانی تجربے ہوتے ہیں جنھیں صوفیا کی اصطلاح میں استدراج یعنی طلبِ مدارج کہا گیا ہے۔ یہ اصطلاح بڑی جامع اور اہلِ تصوّف کی حکیمانہ نظر کی آئینہ دار ہے۔ اس لیے کہ طلبِ مدارج اور حصولِ مدارج دو علیحٰدہ شانیں ہیں اور لازم و ملزوم نہیں ہیں۔

مگر مسلمان صوفیا نے اپنے روحانی تجربے میں طلب و حصول کو لازم و ملزوم بنا دیا ہے، چنانچہ مقامات سلوک طے کرنے کے طریقے اور حصولِ مقصد کے راستے اتنے واضح اور روشن ہیں کہ آج بھی جس کا جی چاہے وہ ان ریاضات و مجاہدات اور تجربات و کیفیات سے گذر کر مقامِ ولایت تک پہنچ سکتا ہے۔ ولایت یقیناً وہبی چیز ہے مگر حضرات صوفیاے چشت نے اپنی تصانیف میں اس کے تمام پہلوؤں پر اتنی تفصیل اور وضاحت سے لکھا ہے کہ اس کا اکتساب سے ملنا دشوار نہیں رہ گیا ہے۔ صرف طلب کی شوریدگی درکار ہے۔

صوفیاے اسلام نے طریقت کا دامن شریعت سے باندھ کر روحانی تجربات کے نتائج کو بالکل یقینی بنا دیا ہے۔ اب شریعت کے احکام فقہیہ،

اعضاء و جوارح کی ظاہری نگرانی کرتے ہیں اور طریقت کے اصول قلب و نفس پر پہرہ دیتے ہیں۔ اس طرح سالک ظاہری اور باطنی دونوں آفات سے محفوظ ہو جاتا ہے۔

حضرت بندہ نواز گیسو درازؒ کا ارشاد ہے کہ طلبِ معرفت اور حصولِ معرفت ہی ایسا شرف ہے جو تمام مخلوقات میں صرف انسان کو نصیب ہوا ہے لیکن یہ عرفان اُسی وقت حاصل ہوتا ہے کہ دل کو ماسوی اللہ سے پاک کیا جائے اور اخلاق کا کلّی طور پر تزکیہ ہو۔ دل میں سوائے اُس کے اور کسی کا خیال نہ آئے، تصوّر میں بس اسی کی صورت اور زبان پر بس اسی کا ذکر رہے۔ جب بات کرے تو اسی کے لطف و کرم کی، اسی کی جفا و وفا کی۔ اُسی کی بخشش و عطا کی۔"

حضرات چشتیہ کی تعلیم سلوک میں سب سے اہم مرتبہ "عشق" کو حاصل ہے۔ اور یہ عشق و طلب ہی بنیادی سرمایہ ہے۔ یہ ہے تو سب کچھ ہے، یہ نہیں ہے تو کچھ بھی نہیں۔ مگر یہ ذوقی اور وجدانی شے ہے۔

پوتھی پڑھ پڑھ جگ موا، پنڈت بھیا نہ کوئے
ڈھائی انچھر پریم کے پڑھے تو پنڈت ہوئے

یہ پریم کے "ڈھائی انچھر" علم و تحقیق کی ساری کوششوں کا خلاصہ ہیں۔ یہ عشق ہی ہے، جس کا مقام علم و عقل دونوں سے بالا ہے، یہ عشق ہی وجہِ تخلیقِ کائنات ہے۔ سیّد محمد گیسو درازؒ فرماتے ہیں :

" اجلِ مطالب اور اجلِّ مقاصد محبّت و معرفت خداوندی ہے۔"

حدیث شریف میں ایک دُعا تلقین کی گئی ہے : اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ حُبَّكَ اَحَبَّ اِلَیَّ مِنْ نَفْسِی وَمِنْ اَهْلِی وَمِنَ الْمَآءِ الْبَارِدِ لِلْعَطْشَانِ ٥

طریقِ چشتیہ میں سماع کا جواز اسی شعلۂ محبّت کو بھڑکانے کے لیے ہے۔ کہیں یہ آتشکدہ سرد نہ ہوجائے اور اس کے شعلے پر افسردگی کا رنگ نہ آنے پائے۔ حالت سماع میں کیفیت عشق کی سرگرمی اتنی ہوتی ہے کہ اگر وہ جہاں سوز کیفیت باقی رہ جائے تو انسان کے پورے وجود کو خاکستر کردے۔ اسی لیے حضرت نظام الدین اولیاء محبوب الٰہیؒ نے اس پر افسوس کیا تھا کہ انھوں نے حالتِ سماع میں انتقال ہونے کی دُعا کیوں نہ مانگی۔

ہر سلسلے کی کچھ خصوصیات ہوتی ہیں۔ طریقِ چشتیہ کی خصوصیت " سوزِ عشق " ہے اور یہ دوامِ طلب اور استقامت کو مستلزم ہے۔ قرآن میں ہے : فَسَوْفَ یَاْتِی اللّٰهُ بِقَوْمٍ یُّحِبُّهُمْ وَیُحِبُّوْنَهٗ (اللہ ایک ایسی قوم کو لائے گا جن سے وہ محبّت کرتا ہے اور جو اس سے محبت کریں گے) اس آیۃ میں کھلی ہوئی بشارت " خاندانِ چشتیہ " کے ظہور کی ہے کیونکہ یُحِبُّهُمْ وَیُحِبُّوْنَهٗ انھیں کی شان ہے اور خاندانِ چشتیہ کی طرف اشارہ " سوف " کر رہا ہے۔

حضرت سید محمد حسینی گیسو درازؒ نے فرمایا ہے کہ تمام کاموں میں سب سے بڑا کام اور تمام مقصدوں میں سب سے بڑا مقصد اللہ جل شانہ کی محبت ہے۔ جب ہر شے فنا ہوجانے والی ہے تو پھر عمر کس کام میں صرف

کی جائے۔

سب سے بہتر اور عمدہ شے عبادت الٰہی ہے مگر اس کو بھی فنا ہے۔ آج ایک آدمی نماز پڑھتا ہے، بہترین طریقے پر تمام شرائط پوری طرح ادا کر کے پڑھتا ہے۔ کل قیامت کے روز اُسے اِس نیکی کا اجر ملے گا، لیکن نماز کہاں ہو گی؟

تو جب نماز (عبادت) کا یہ حال ہو گا تو جہاں کی اور اشیاء یعنی مال و جاہ و قوت و عیش و تمتّع کا کیا ذکر؟ مگر حق تعالیٰ کی محبّت کو دوام ہے وہ رہے گی اور ازلی و ابدی ہے۔ جب محبوب خود ازلی و ابدی ہے تو اس کی دوستی بھی ایسی ہی ہوئی پس جس کو قلبِ سلیم عطا ہوا وہ سب کو پسِ پشت ڈال کر صرف محبّتِ الٰہی کی طرف رُخ کرتا ہے۔" (فوائد)

حضرت بندہ نواز کی نسبت عشقیہ نسبت ہے جو خالص چشتی رنگ ہے۔ رنگ کا منتہا بے رنگی اور عشق کی حد فنائے تامّ ہے جسے ہندی والا یوں کہتا ہے:

لکڑی جل کوئلا بھیو، کوئلا جل بھیو راکھ
میں پاپن ایسی جلی، کوئلا بھئی نہ راکھ

یہ وہ فنا ہے جہاں ملک الموت کا بھی گذر نہیں ہے۔

در کوئے او عاشقاں چناں جاں بدہند
کانجا ملک الموت نگنجد ہرگز

حوالہ جات:

۱۔ صوفیائے کرام کے اصول تربیت پر متعدد کتابیں لکھی گئی ہیں۔ امام غزالی کی تصانیف کے علاوہ مرصاد العباد، کشف المحجوب اور عوارف المعارف چھٹی ساتویں صدی ہجری میں بہت مقبول تھیں۔ بعد کے زمانے میں بھی ان کتابوں کو نصاب کے طور پر پڑھایا گیا ہے۔ سلسلہ چشتیہ نظامیہ میں، علی بن محمود جاندار کی مرتبہ درر نظامی، خواجہ حماد کاشانی کی احسن الاقوال اور خواجہ رکن الدین کاشانی کی شمائل الاتقیا اور رموز الوالہین خاص طور پر مطالعہ کے قابل ہیں۔

۲۔ فوائد الفواد : ۱۱۷ ۔ سیر الاولیاء : ۳۲۱ ۔ خیر المجالس : ۲۵۳

۳۔ فوائد الفواد : ۳۱۹ ۔ درر نظامی (باب ۲) : ۳۸

۴۔ ایضاً : ۳۲۱

۵۔ ایضاً : ۱۵۷

۶۔ فوائد الفواد : ۲۲۶ ۔ سلک السلوک ص ۲۴ (طبع ۱۳۲۹ھ)

۷۔ ایضاً : ۳۱۲

۸۔ خانقاہ کو آج بے عملوں کا مسکن سمجھا جاتا ہے مگر حضرت چراغ دہلیؒ نے خیر المجالس میں فرمایا (ص ۲۳۸) کہ یہ دو لفظوں سے مرکب ہے۔ خان تو وہی ہے جو فارسی میں خانہ ہے

اور قاہ عربی زبان میں عمل اور عبادت کو کہتے ہیں۔ گویا خانقاہ کے لفظی معنی ہیں عبادت گاہ یا دار العمل ۔ سلوک کی تعلیم اس لیے ضروری ہے کہ درویشی کا مقصد "اخلاق اللہ" پیدا کرنا ہے اور اخلاق یا کسب سے حاصل ہوتا ہے یا صحبتِ اہلِ دل سے ۔ خانقاہ میں رہ کر تکمیلِ سلوک کا جواز حضرت چراغ دہلیؒ نے اس آیۃ سے پیش کیا ہے :

یا أیہا الذین آمنوا اتقوا اللہ وکونوا مع الصّادقین ۔ (خیر المجالس: ۱۰۶)

۹۔ امام غزالی : المنقذ من الضلال

۱۰۔ فوائد الفواد : ۴۷

۱۱۔ ایضاً : ۳۴۵

۱۲۔ بیعت اور متابعت کاملہ دونوں کی سند قرآن میں ہے :

إنَّ الذّینَ یُبایعُونَکَ إنّمَا یُبَایعُونَ اللہ یَدُ اللہِ فَوقَ أیدِیھِمْ فمن نکثَ فانّما ینکثُ علیٰ نفسہ ومَن أوفیٰ بما عٰھدَ علیہ اللہ فَسیؤتیہِ اَجراً عظیماً

اور دوسرے موقع پر ہے :

فلا وربّکَ لَایؤمنونَ حتّیٰ یحکّموکَ فیما شجرَ بینھم ثُمّ لَایجدُوا فی انفسھم حَرجاً ممّا قضَیتَ ویُسلّموا تَسلِیما ۔ (ان آیات کی تفصیل کے لیے دیکھو ۔ سبع سنابل ۔ص ۴۰۔۴۲)

۱۳۔ خیر المجالس : ۲۷۰

۱۴۔ فوائد الفواد : ۲۴۹ ۔ سبع سنابل : ۴۷

۱۵۔ ایضاً : ۲۵۰ ۔ "از برائے اقتداء رعایت شریعت واجب است" خیر المجالس: ۲۶

۱۶۔ خیرالمجالس : ۲۴۲

۱۷۔ فوائدالفواد : ۱۱۰ ۔ سیرالاولیاء : ۳۲۱

۱۸۔ خیرالمجالس : ۲۶۶ ۔ فوائدالفواد : ۱۱۰

۱۹۔ فوائدالفواد : ۳۷۲ ۔ نیز دیکھیے خیرالمجالس اور جوامع الکلم

۲۰۔ فوائدالفواد : ۲۹۲

۲۱۔ فوائدالفواد : ۱۳۲ ۔ دررنظامی (باب ۱۴) : ۱۱۹ ۔ سیرالاولیاء : ۳۲۶

۲۲۔ کلاہ توبہ وانابت کی علامت ہے ۔ سبع سنابل : ۴۵

۲۳۔ فوائدالفواد : ۲۹۱

۲۴۔ ایضاً : ۳۲۹

۲۵۔ خیرالمجالس : ۱۰۶ ۔ ایک اور موقع پر حضرت چراغ دہلیؒ نے نفس کشی کا جواز قرآن کی اس آیۃ سے ثابت کیا ہے ۔" فتوبوا الیٰ بارِئکم فاقتلوا انفُسَکُم" جس میں قتلِ نفس کو توبہ بتایا گیا ہے ۔ (خیرالمجالس : ۱۹۷)

۲۶۔ خیرالمجالس : ۷۰

۲۷۔ ایضاً : ۷۰

۲۸۔ ایضاً : ۱۲۸

۲۹۔ فوائدالفواد : ۲۶۴

۳۰۔ فوائدالفواد : ۳۳۳ ۔ عوارف المعارف (اُردو ترجمہ نول کشور ۔ ۱۲۹۱ ھ) ص ۱۹۸ میں اسے سَہل بن عبداللہ کا قول بتایا گیا ہے ۔ نیز ملاحظہ ہو غرائب الفوائد تصنیف حضرت شیخ عبدالقدّوس گنگوہی (متوفی ۹۴۴ ھ) ص ۱۴

۳۱۔ خیر المجالس : ۶۸ نیز ۱۱۵ ۔ فوائد الفواد : ۴

۳۲۔ فوائد الفواد : ۲۱۳ ۔ خیر المجالس : ۵۹ ۔ عوارف المعارف (اُردو) : ۱۳۵

۳۳۔ خیر المجالس : ۱۷۷

۳۴۔ فوائد الفواد : ۲۱۶

۳۵۔ خیر المجالس : ۲۵

۳۶۔ چشتی صوفیا کا خیال ہے کہ اعمال دو طرح کے ہیں ۔ عمل بالجوارح اور عمل بالقلب۔ پہلی قسم کے اعمال حقوق العباد پر اثر انداز ہوتے ہیں اور دوسری شق کے حقوق اللہ پر۔ اعمال قلبی کی نگرانی کے لیے "مراقبہ" تجویز کیا جاتا ہے۔ (خیر المجالس : ۵۷) اس کا حاصل یہ ہے کہ خدا کو حاضر و ناظر سمجھا جائے ۔ اعبد ربک کانک تراہ و ان لم تکن تراہ فانہ یراک ۔ خدا کی عبادت اس طرح کرو جیسے تم اسے دیکھ رہے ہو اور یہ نہ ہو سکے تو کم از کم اتنا سمجھو کہ وہ تمھیں دیکھ رہا ہے۔ اس کیفیت کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک اعرابی کے سوال کا جواب دیتے ہوئے "احسان" فرمایا تھا جو تصوّف ہی کا دوسرا نام ہے۔ اس سے مقصود قلب کی نگرانی ہے تاکہ وہ "قلب سلیم" بن سکے کیونکہ قرآن میں کہا گیا ہے کہ یوم حساب میں "قلب سلیم" کے سوا کچھ کام نہ آئے گا۔ "یوم لا ینفع مالٌ ولا بنُون اِلّا من أتی اللہ بقلبٍ سلیم" (درر نظامی : ۲۰)

۳۷۔ فوائد الفواد : ۴۲۰

۳۸۔ فوائد الفواد : ۲۳۹ ۔ درر نظامی : ۵۸

۳۹۔ فوائد الفواد : ۱۴۸ ۔ درر نظامی (باب ۲۳) : ۲۰۰ میں ان اشعار کو حضرت شیخ ابو سعید ابوالخیرؒ کا نتیجۂ فکر بتایا گیا ہے۔ مگر آقائی سعید نفیسی نے ایک مضمون میں جو

مجلہ دانشکدہ ادبیات، تہران میں شائع ہوا تھا، انھیں شیخ سیف الدین باخرزی کی تصنیف بتایا ہے۔

۴۰۔ خیر المجالس (ضمیمہ) : ۲۸۶

۴۱۔ کشف المحجوب (اُردو ترجمہ) : ۲۹۴

۴۲۔ فوائد الفواد : ۱۶۴-۱۶۳

۴۳۔ فوائد الفواد : ۴۰۳ نیز ۴۱۹ تا ۴۲۱

۴۴۔ سیر الاولیاء : ۳۲۵ ۔" راہِ تصوف راہِ صِدق است۔ صدق و اخلاص می باید کرد۔" خیر المجالس : ۱۳۸ نیز ۱۴۱۔ ایک اور موقع پر فرمایا کہ صدق زیادہ ہو تو قلیل عمل بھی کافی ہے۔ کثرتِ نوافل سے بہتر یہ ہے کہ حضوری حاصل ہو۔ خیر المجالس : ۱۹۸ نیز درر نظامی (باب ۵) : ۶۴

۴۵۔ درر نظامی : ۳۶ - ۳۷

۴۶۔ خیر المجالس : ۶۵ - ۶۶

۴۷۔ کشف المحجوب (اُردو ترجمہ) : ۸۹

۴۸۔ حضرت چراغ دہلیؒ نے فرمایا : درہر کارے کہ ہستی می باش۔ فرمان دہی و شغل دنیا می کُن۔ امّا می باید کہ زبانِ تو یک زمان از ذکرِ خدائے تعالیٰ خالی نباشد..." (خیر المجالس: ۱۲۲) اس سلسلے میں حضرت چراغ دہلیؒ نے شیخ ابو سعید ابو الخیر کی امارت کا قصہ سنایا جن کے خیمے میں سونے کی میخیں دیکھ کر کسی نے اعتراض کیا تو انھوں نے کہا تھا کہ "میخ ہائے زرّیں در دل نہ زدہ ایم در گلِ زدہ ایم۔" (خیر المجالس : ۲۱۳)

۴۹۔ زراعت اور تجارت کو بہترین کسب فرمایا ہے (خیر المجالس : ۲۷۷) اور نوکری

کے لیے بھی یہ حکم ہے کہ "چاکری حجاب نیست"۔ (خیر المجالس : ۲۴۳)

۵۰۔ فوائد الفواد : ۱۲ نیز ۱۲۲ - ۱۲۱ - حضرت نظام الدینؒ کو نصف تنکہ (اس عہد کا سکّہ) بھی اپنے پاس ایک رات رکھنا ناگوار ہوتا تھا اور فرماتے تھے کہ یا اللہ کب صبح ہوگی جو میں اسے خرچ کروں۔ (فوائد الفواد: ۸۳)

۵۱۔ فوائد الفواد : ۳۲۰

۵۲۔ خیر المجالس : ۲۵۲

۵۳۔ فوائد الفواد : ۲۲۴ - سلک السلوک : ۱۹

۵۴۔ خیر المجالس : ۱۸۸

۵۵۔ ایضاً : ۸۴

۵۶۔ فوائد الفواد : ۴۲۷

۵۷۔ ایضاً : ۳۱۸

۵۸۔ تعلق بکسب مانع توکّل نیست۔ خیر المجالس : ۵۶

۵۹۔ فوائد الفواد : ۳۱۹

۶۰۔ حضرت چراغ دہلیؒ نے فرمایا کہ اگر نہ دنیا خواستہ و نہ حور و قصور خواستہ۔ چہ خواستہ؟ لقائے ذات پاک حق تعالیٰ خواستہ فردا در مشاہداتِ حضرت عزّت باشد۔ (خیر المجالس : ۳۴)۔ اور فرمایا کہ "اول مجاہدہ بعد ازاں مشاہدہ"۔ (خیر المجالس : ۱۵۰) اگر مطلوب کی قدر معلوم ہو تو سخت سے سخت مجاہدہ بھی آسان نظر آتا ہے۔ (خیر المجالس : ۱۵۳)

۶۱۔ فوائد الفواد : ۲۰

۶۲۔ خیرالمجالس : ۲۵۸

۶۳۔ فوائدالفواد : ۳۴۰

۶۴۔ فوائدالفواد : ۱۴ ۔ خیرالمجالس : ۶۱ ۔ نیز ۲۲۸ ۔ نیز ۲۵۵

۶۵۔ فوائدالفواد : ۴۰۲

۶۶۔ خیرالمجالس : ۲۵۳

۶۷۔ فوائدالفواد : ۱۷۸ ۔ دررنظامی (اُردو ترجمہ) : ۹۲

۶۸۔ حضرت محبوب الٰہیؒ پر ایک بار حج و زیارت کا اشتیاق غالب ہوا تو آپ اجودھن پہنچ گئے اور مزار شیخ کا طواف کیا۔ فرماتے ہیں کہ زیارتِ شیخ سے حج کی نعمت حاصل ہوئی مع شئیٍ زائد۔ فوائدالفواد : ۲۶۳ ۔ حج کے بارے میں چشتی صوفیا کا مسلک ایک حکایت میں بھی بیان ہوا ہے۔ (خیرالمجالس : ۲۱۵)

۶۹۔ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی خانقاہ کا حال ان کے خلیفہ حضرت نصیرالدین چراغ دہلیؒ نے یوں بیان کیا : " از پگاہ تا شام خلق بیامدے۔ نماز خفتن ہم خلق برسیدے۔ امّا خواہندہ بیش ازاں بود کہ آرندہ و ہر کہ چیزے بیاوردے چیزے یافتے۔" یعنی صبح سے شام تک خلقِ خدا آتی رہتی تھی۔ عشا کی نماز کے وقت بھی سلسلہ جاری رہتا تھا مگر مانگنے والوں کی تعداد و نذر دینے والوں سے زیادہ ہی ہوتی تھی۔ جو کوئی چیز نذر لاتا تھا وہ کچھ نہ کچھ عطیہ بھی پاتا تھا۔ (خیرالمجالس : ۲۵۷) حضرت بابا فرید گنج شکرؒ کی خانقاہ کے دروازے بھی نصف شب تک کھُلے رہتے تھے اور " ہیچ کس بخدمت ایشان نیامدے کہ اورا چیزے نصیب نہ کردے۔" (فوائدالفواد : ۱۲۵) اور فرماتے تھے کہ " ہر کہ بر من می آید چیزے می آرد۔ اگر مسکینے بیاید و چیزے نیارد

ہر آینہ مرا چیزے بدو باید داد۔" (فوائد الفواد : ۳۳۶)

۷۰۔ درر نظامی (باب ۱۸) ص ۱۶۴

۷۱۔ خیر المجالس : ۷۵

۷۲۔ خیر المجالس : ۱۰۵۔ نیز دیکھو درر نظامی (باب ۱۷) ص ۱۶۲

۷۳۔ سیر الاولیاء

۷۴۔ جوامع الکلم (قلمی) ۷۸۔ الف

۷۵۔ جوامع الکلم فارسی (قلمی) ورق ۷۸ ب

۷۶۔ ہر کہ از معصیت باز می آید او را در طاعت ذوق باشد و در ذوق طاعت۔

خیر المجالس : ۱۵۸

۷۷۔ سیر الاولیاء : ۳۲۲ و ۳۲۸

۷۸۔ ایضاً : ۳۲۵

۷۹۔ ایضاً : ۳۲۹

۸۰۔ درر نظامی (باب ۴) : ۵۶

۸۱۔ فوائد الفواد : ۳۷۱۔ سیر الاولیاء : ۳۲۹۔ درر نظامی (باب ۴) : ۵۷

۸۲۔ فوائد الفواد : ۲۵۴۔ درر نظامی : ۵۷

۸۳۔ سیر الاولیاء : ۳۲۸۔ نیز سبع سنابل : ۴۴

۸۴۔ خیر المجالس : ۲۲۵

۸۵۔ فوائد الفواد : ۳۴۶

۸۶۔ ایضاً : ۱۲۶ نیز ۲۲۹

۸۷۔ فوائدالفواد : ۲۲۹

۸۸۔ ایضاً : ۶۶

۸۹۔ ایضاً : ۴۰

۹۰۔ ایضاً : ۲۰۸۔ دررنظامی (باب ۵) : ۶۳

۹۱۔ ایضاً : ۳۳۷

۹۲۔ ایضاً : ۶۵

۹۳۔ ایضاً : ۳۵۶

۹۴۔ ایضاً : ۶۳

۹۵۔ ایضاً : ۱۳۰

۹۶۔ ایضاً : ۲۳۳

۹۷۔ فوائدالفواد : ۲۹۴

۹۸۔ ایضاً : ۹۰۔۹۱

۹۹۔ ایضاً : ۱۷۵۔۱۷۶

۱۰۰۔ احسن الاقوال (قلمی) ملفوظات حضرت خواجہ برہان الدین غریبؒ (متوفی ۶۳۷ھ)

۱۰۱۔ فوائدالفواد : ۱۷۰

۱۰۲۔ ایضاً : ۱۷۱

۱۰۳۔ ایضاً : ۶۷۔ خیرالمجالس : ۱۶۳

۱۰۴۔ ایضاً : ۱۶۲۔ دررنظامی (باب ۱۳) ۱۰۹

۱۰۵۔ ایضاً : ۸۲

۱۰۶- فوائدالفواد : ۸۲

۱۰۷- ایضاً : ۱۶۴ "محبت این مردار دنیا اصلا در دل نباشد و ہر چہ برسد در راہِ حق بدہند" خیرالمجالس : ۹۰

۱۰۸- فوائدالفواد : ۳۳۷ - ۳۳۸

۱۰۹- ایضاً : ۳۳۸

۱۱۰- ایضاً : ۳۵۸ - سیرالاولیاء : ۹۱

۱۱۱- حضرت محبوب الٰہیؒ نے فرمایا : ہر نورے کہ موافق احکام شرع نیست آں ظلمت است (فوائدالفواد : ۴۰۰) اور حضرت چراغ دہلیؒ کا قول ہے کہ حکمِ شرع کے سامنے مسلکِ پیر کی بھی کوئی حقیقت نہیں۔ (خیرالمجالس)

۱۱۲- فوائدالفواد : ۳۰۶

۱۱۳- ایضاً : ۲۴۱ - ۲۴۳ - دررنظامی (باب ۲۱) : ۱۸۶ - ۱۸۷ - سیرالعارفین (اُردو ترجمہ) : ۱۲۲ - ۱۲۳

۱۱۴- خیرالمجالس : ۴۶ نیز ۱۷۱

۱۱۵- فوائدالفواد : ۲۴۳

اسلام اینڈ دی ماڈرن ایج سوسائٹی

کی اُردو مطبوعات

○

۱۔ انشورنس اسلامی معیشت میں	ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی	۲/-
۲۔ چشتی تعلیمات اور عصرِ حاضر میں ان کی معنویت	ڈاکٹر نثار احمد فاروقی	۹/۵۰
۳۔ عالمِ اسلام میں تجدّد کی تحریکیں	ڈاکٹر سیّد عابد حسین	۴/۵۰
۴۔ عصرِ حاضر کی اسلامی تحریکیں	ڈاکٹر احتشام ندوی	

(زیرِ طبع)

۵۔ امن اور آشتی کا مذہب اسلام — ڈاکٹر خواجہ غلام السیّدین

(زیرِ طبع)

○